TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222279
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY 9936

Call No. ۸۹۱۵ ع۳۳۴ Accession No. ۹۹۳۶

Author تاجور ت . م

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

اُردو مرکز لائبریری

اُردو ادب کے معیاری مختصر افسانوں کا علمی انتخاب

منتخب افسانے

جلد پنجم

مُرتبہ

مولینا تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج ایڈیٹر اتحاد

بہ اعانت

حضرات اراکین اُردو مرکز لاہور

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز پبلشرز

اُردو مرکز لاہور

50/- 1952

ملک کی واحد اکیڈمی (اُردو مرکز لاہور) انتخاب ہفت کشور پنجاب کے دار السلطنت لاہور میں ذیل کے اہم مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک بڑے سرمایہ سے قائم کی گئی ہے۔

(۱) اُردو لٹریچر کے ذخیرۂ بیکراں میں سے اُس جاندار اور مفید حصے کو جو محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ حتی الامکان تاریخی ترتیب کے ساتھ مجلدات میں شائع کرنا۔

(۲) اُردو زبان کی مکمل انسائیکلوپیڈیا کی تالیف۔

(۳) ایک جامع اُردو لغات کی ترتیب۔

(۴) اُردو مرکز کی مجلس ادبا (جو درحقیقت اردو زبان کے لئے ایک ادبی دار الافتا ہے) کے ذریعہ علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع و متنازع فیہ امور کے متعلق ناطق فیصلہ کرنا۔

ایک باوقار علمی جماعت جسمیں ملک کے سربرآوردہ اہلِ قلم اور منتخب انشاپرداز شریک ہیں اُردو مرکز مذکورہ بالا اہم مقاصد میں سے پہلے مقصد کی تکمیل پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کئے ہوئے ہے اسکی پہلی زرین کوشش تیس گرانقدر مجلدات کی صورت میں قدرشناس نگاہوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ آنریبل سر شیخ عبدالقادر بالقابہ۔ خان بہادر شیخ نور الٰہی آئی۔ ای۔ ایس۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی جیسے نقادانِ ادب کے مشوروں کے ماتحت یہ مجلدات جماعت اُردو مرکز نے ترتیب دئے ہیں۔ قدرشناس اہلِ نظر نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ تو ہم مجلدات شائع کرکے اردو مصنفین کو بڑی بڑی لائبریریوں سے بے نیاز کر دینگے۔

ناظم ... دیال سنگھ کالج۔ ایڈیٹر اتحاد و چیف ایڈیٹر اردو مرکز لاہور

باہتمام بابو گوراندتہ مل چھپا

فہرست جلد پنجم

نمبر شمار	فسانہ	فسانہ نگار
۱	چھپا	مولانا عبد المجید سالک بی۔ اے مدیر "انقلاب"
۲	طلسم	برگیڈ میجر میاں عطاء الرحمٰن صاحب بی۔ اے
۳	ایک مصلح بُت تراش	مولانا نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار"
۴	بازیافت	منشی پریم چند بی۔ اے
۵	اعترافِ گناہ	شیخ محمد ہادی حسین ایم اے۔ مدیر ہزار داستان
۶	پری	نامعلوم
۷	جاں نثار	پنڈت بدری ناتھ سدرشن جرنلسٹ
۸	عشاقِ عرب	مسٹر محمد حسین پیلی بھیتی۔
۹	حسنِ اتفاق	ابو الفاضل سید راز چاندپوری
۱۰	غلط فہمی	خان قدرت اللہ خاں دیوانہ بریلوی

اُردو کی کم مائگی اور اُس کی بے بضاعتی کی داستان اگرچہ اب ایک افسانۂ کہن ہوگئی ہے تاہم بعض ارباب علم وفن کے حلقوں میں اس کا اعادہ اب بھی اُسی سنجیدگی و بلند آہنگی سے کیا جاتا ہے جس طرح اب سے پچیس تیس برس قبل کیا جاتا تھا۔ اسکی وجہ صرف یہی نہیں کہ ممالک غیر کے انشاء و ادب کی تابانیوں نے اُن کی نگاہیں خیرہ کر دی ہیں اور اُن کے نزدیک اُردو ادب و شاعری عبارت ہے چند سطحی، پُرمبالغہ و بے کیف مجموعہ نظم و نثر سے بلکہ اس کے علاوہ وہ بداہتہً یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اردو ادب و شاعری کا سب سے بڑا علمبردار بھی جب اُردو لٹریچر کی حمایت میں زبان و قلم کو جنبش دیتا ہے تو اسی سطحی نمونۂ نثر اور پست و پامال شعریت پر گرم توجہ نظر آتا ہے جسے مذاق عالیہ کی بارگاہ صرف بے توجہی و بے اعتنائی کا مستحق سمجھتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اُردو نظم و نثر کے بیشتر نمونے ہندوستانیوں کے زمانۂ انحطاط و تنزل کی پیداوار اور ہماری پستی و نکبت کے پس ماندہ آثار و یادگار ہیں اور اس طرح اُردو ادبیات کا تمام صالح و غیر صالح سرمایہ باہم خلط ملط ہو کر رطب و یابس کا ایک انبار ضخیم بن گیا ہے۔ ان حالات میں ایک طرف تو وہ بلند علمی طبقہ

یں اس کی
الی شدید معترضوں
خاشاک سے کار آمد
دجاندار حصے ہو... (قدر آشنا ہو سکے نتیجہ یہ ہے
کہ آج موافق و مخالف دونوں اُس کی قدر و قیمت کے اصلی اندازے سے محروم ہیں
اِس وقت حالت یہ ہے کہ اُردو کو تہی مایہ اور بے بضاعت کہنا ایک
طرح پر فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ یونیورسٹیوں ٹیکسٹ بُک کمیٹیوں
اور کونسلوں وغیرہ میں بھی وقتاً فوقتاً اور موقع بے موقع اُس کی تہی مایگی اور
بے بضاعتی کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت آشنا اصحاب اس خیال
سے کبھی متفق نہیں ہوتے۔ جن لوگوں نے اُردو کی فہرستہائے کتب پر کبھی
نظر ڈالی ہے اور لائبریریوں میں جا کر نادر الوجود قلمی و مطبوعہ نسخوں کا مطالعہ
کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اُردو زبان ایک بحر بیکران ہے جس کا دامن تابدار
موتیوں کا ایک سیر حاصل جلوہ زار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو ادبیات کا
دامن رطب و یابس کے بدنما داغوں سے کلیتہً پاک نہیں لیکن یہ عیب
دُنیا کی اُن ترقی یافتہ زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جو فی زمانہ علمی زبانیں
کہلاتی ہیں۔ اگر اُردو میں پست و پامال لٹریچر کی اشاعت بڑی کثرت و
سرعت سے ہو رہی ہے۔ تو انگریزی میں بھی چار آنے کے لکھنے
والے مصنفین کی تعداد کسی طرح کم نہیں۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ اُن کی

ہے اور جو در اصل اُسکی آیندہ ترقیات کا اصلی ہیولیٰ بھی ہے جلد سے جلد انتخاب کے بعد مستقل مجلّدات کی صورت میں ترتیب دینا +

(۲) اُردو میں ایک مخزن العلوم (انسائیکلوپیڈیا) تیار کرنا +

(۳) اردو زبان کے فتوحات ادبیہ کا ایک منتخب مجموعہ سال بسال مجلّدات کی شکل میں پیش کرتے رہنا + (۴) گرانقدر نایاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ اُردو کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور حسب استطاعت ہر قسم کی علمی و ادبی اردو تصنیفات و تالیفات کی اشاعت +

(۵) اردو مرکز کی مجلس مشاورۃ (جو درحقیقت اُردو زبان کیلئے ایک ادبی دارالافتا ہے) کے ذریعہ علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع اور متنازعہ فیہ امور ادبیہ کے متعلق ناطق فیصلہ +

ان نعمات کی اوّلین قسط یہ ہے کہ نظم و نثر کے اس بہترین حصّہ کو جسے اُردو ادب اپنی موجودہ مدّتِ حیات میں فراہم کر سکا ہے ایک باقاعدہ منتظم صورت میں ملک کے سامنے پیش کردے۔ یہ مجموعہ جہاں ایک طرف اُردو ادب و شاعری کا حاصل و عطر ہوگا وہیں یہ امر بھی مدنظر ہے کہ حتی الامکان اس میں ایک حد خاص تک ترتیبِ تاریخی بھی ملحوظ ہے تاکہ ہر دَور کے خصوصیات اور ادبی دماغ کے ارتقائی مدارج کا بھی سرسری طور پر اندازہ ہو سکے۔ اس التزام کے ساتھ ساتھ یہ اہتمام بھی پیش نظر ہے کہ شعرا و اُدبا کی تصاویر اور اُن کے حالات سے بھی (جس قدر دستیاب و میسّر ہو سکیں) ان مجلّدات کی رونق و زینت میں اضافہ کیا جائے

ان بلند اور وسیع عزائم کی اہمیت اور ان کے مشکلات کا جناب خود ہی اندازہ فرما سکتے ہیں۔ اُردو مرکز لاہور نے خدا کا نام لیکر اس کام کو شروع کر دیا ہے۔ جسے ارباب ذوق کی مشہور و قابل قدر جماعت نہایت سرعت سے انجام دے رہی ہے بلکہ اس کام کا ایک بڑا حصہ پایہ تکمیل تک پہنچ بھی چکا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے مشہور فضلاء و ادیب بھی اپنے زرّیں مشوروں اور اعزازی خدمات سے اُردو مرکز کی اعانت فرما کر خدمت زبان کا غیر فانی ثبوت دے رہے ہیں لیکن مشرقی اخلاق و ذہنیت کی ناقابل تردید عظمت یہ ہے کہ یہاں کے کاموں کی تمام مشکلات کو صرف سرمایہ و مالیات ہی کے زور پر حل نہیں کیا جا سکتا اسلئے کہ ملک میں بحمد اللہ ایسے غیور و عالی حوصلہ بزرگوں کی کمی نہیں جو ملک کے مفید کاموں کی اعانت و حوصلہ افزائی کو مادی "سود و زیاں" سے آلودہ کرنا پسند نہیں کرتے اور صرف بے غرضانہ اعانت کو اپنی خدمات کا حقیقی نعم البدل تصوّر کرتے ہیں۔ نظر بران جناب سے بکمال ادب گذارش ہے کہ اپنی نظم و نثر کا ایک منتخب اور خوشخط مجموعہ مع اپنے حالات اور بلاک کے (اور اگر بلاک موجود نہ ہو تو تصویر) اردو مرکز انارکلی لاہور کے نام ارسال فرمائیں اسی کیساتھ ہمارے کاموں کے متعلق اگر کوئی مفید مشورہ بھی عنایت فرمائینگے تو اسے بھی نہایت شکریہ کیساتھ قبول کیا جائیگا۔ اُردو نظم و نثر کی کوئی ایسی کارآمد تصنیف و

تالیف جو ابتک کنجِ گمنامی میں پڑی ہوئی ہو اسکے منتخب حصے معہ مصنف یا مؤلف کے حالات کے اگر دستیاب ہو سکیں تو وہ بھی براہ عنایت ارسال کئے جائیں۔ اِس قسم کی زرّیں امداد دینے والے حضرات کا اِس تاریخی سلسلہ میں شکریہ کے ساتھ اعتراف کیا جائیگا اُنکے علاوہ کارکنانِ اُردو مرکز ایسے تمام حضرات سے جنہوں نے اُردو ادب و شاعری کی کوئی خدمت انجام دی ہو یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ خود بھی اس نادر موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینگے اسلئے کہ ان کے حالات اور گرانمایہ کارنامے اگر اُردو ادب شاعری کے اس مستقل اور مبسوط ریکارڈ اور مخزن میں نہ آئے تو یہ امر بڑی حد تک طرفین کیلئے قابلِ افسوس ہوگا۔ اَلْمُلْتَمِسْ مہتمم اردو مرکز۔ انارکلی لاہور

چنانچہ اس درخواست پر اطرافِ ملک سے ہماری جسقدر حوصلہ افزائی کی گئی وہ ہماری اُمیدوں سے کہیں زیادہ تھی۔ انتہا یہ کہ بعض کرمفرماؤں نے تو اپنے مستقل کارنامہ ہائے علمی ہمیں اپنی بساط اعانت کیلئے مرحمت فرمادئے جن سے گو ہم بقدرِ ضرورت ہی متمتع ہوسکے تاہم اُنکی مخلصانہ اعانت کے تہ دل سے معترف و سپاس گذار ہیں۔

اُردُو اَدَبْ اَور اُس کا سَرمایۂ علمی

ابتدائی انتظامات مکمل ہو چکنے کے بعد ہم نے پانچ ہزار روپیہ کے صرف سے ایک لائبریری مرتب کی اسمیں ہمین جو دقتیں پیش

آئیں وہ بہت صبر آزما تھیں۔ مروّجہ کتب کا حاصل کر لینا تو چنداں دشوار نہ تھا کسی مطبع یا کتبخانہ کی فہرست اٹھائی اور اُسمیں سے جو کتابیں مفید مطلب نظر آئیں۔ انکی قیمت منی آرڈر کے ذریعے ارسال کر دی لیکن جو نادر الوجود اور عسیر الحصول نسخے ملک کے دور افتادہ گوشوں میں قدیم مگر گمنام گھرانوں اور غیر معروف لائبریریوں کے اندر لالۂ صحرا کی طرح اپنی جان نواز نکہت رائگان کر رہے ہیں ان کے مہیّا کرنے میں صرف زر سے زیادہ تلاش و تحقیق کی ضرورت تھی بہر حال جہاں سے اور جس طرح جو کتابیں مل سکتی تھیں ہم نے اپنی لائبریری میں جمع کیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اُردو ادب کی کل کائنات اتنی ہی نہیں اسکی گرانبہا متاع وہ علمی مضامین ہیں جو انتہائی تلاش و کاوش سے ملک کے سر آوردہ ارباب فکر کے قلم سے وقتاً فوقتاً نکلتے رہے ہیں اور جنکے حقیقی سرمایہ دار ہمارے ادبی رسائل ہیں جو ایک مدت سے غیر محسوس طور پر خدمت زبان کی انجام دہی میں مصروف ہیں ان رسائل میں مندرجۂ ذیل خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں:-

مخزن۔ معارف علیگڈھ۔ معارف اعظم گڈھ۔ اُردو (دکن) الناظر لکھنؤ زمانہ کانپور۔ اُردوئے معلّیٰ علی گڈھ۔ نگار بھوپال۔ علی گڈھ میگزین۔ ذخیرہ حیدر آباد۔ دکن ریویو۔ ہمایوں۔ بہارستان۔ نیرنگ خیال۔ ہزار داستان دلگداز۔ ادیب۔ الہلال۔ کہکشاں۔ العصر۔ نوید۔ نقاد۔ شمع آگرہ خطیب دہلی۔ تمدّن دہلی۔ کوکب گونڈہ۔ عالمگیر لاہور۔ شباب اُردو لاہور۔ نقیب بدایوں۔ دلکش مراد آباد۔ صوفی۔ المعلم (دکن)۔ پیمانہ۔ نور جہاں۔ عبرت۔ زبان قوس قزح۔ مرقع لکھنؤ۔ افادہ آگرہ۔ تحفہ حیدر آباد۔ صلائے عام دہلی

کمال دہلی - زبان اردو لاہور - ادیب اردو لکھنؤ - نظارہ میرٹھ
نوبہار علیگڈھ وغیرہ +

مذکورہ رسائل کی ادبی خدمات کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ آج تقریباً ہر شعبۂ علم کے متعلق ہم ایک معتدبہ و معقول مواد فراہم کرچکے ہیں انہیں بعض ادبی مضامین بھی ملے جسمیں اس حد تک اجتہاد فکر و دقت نظر سے کام لیا گیا ہے کہ ہم انہیں اکتشافات و تحقیقات علمیہ کا درجہ دیسکتے ہیں اخبارات اور رسائل پر بیشتر سرسری نظریں پڑتی ہیں اور کسی اچھے سے اچھے مضمون کو بھی دیکھکر اردو ادب کی مجموعی حیثیت کا بالعموم اندازہ نہیں ہوتا لیکن ان تمام رسائل سے ہر موضوع [illegible] کہ اگر علیحدہ علیحدہ باترتیب جمع کیا جائے تو معلوم ہو کہ اردو ادب کا آج کیا درجہ ہے اور وہ زبان جو محکومیت کے آغوش میں نشوونما پارہی ہے آج کس حد تک آزاد ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش چلنے کیلئے بیقرار ہے +

چنانچہ کارکنان اردو مرکز نے مستقل تالیفات و تصنیفات [illegible] کے علاوہ مذکورہ رسائل کے گہرے مطالعہ و انتخاب کے بعد کئی لاکھ صفحات کا عطر کھینچ کر رکھدیا ہے اور آج ہم اس امر کے اعلان کی جسارت رکھتے ہیں کہ تقریباً تمام شعبہ جات علم و ادب پر ہمنے ڈیڑھ سو مجلدات تیار کرلئے ہیں اور جہانتک حالات مساعدت کرینگے ہم انشاء اللہ بہ اقساط انہیں برابر شایع کرتے رہینگے ان مجلدات سے نہ صرف یہ کہ ملک میں ایک سنجیدہ و کارآمد لٹریچر کی اشاعت ہوگی بلکہ ایک ایسی مختصر سی لائبریری بھی بآسانی تیار ہوسکتی ہے جس سے عام مؤلفین و مصنفین بڑے بڑے دفاتر کی ورق گردانیوں سے بے نیاز ہوسکتے ہیں آیندہ جس کسی مصنف کو کسی اہم مضمون تصنیف یا تالیف کی ضرورت ہوگی وہ اس تصنیف یا تالیف کے متعلق اردو مرکز کے منتخبات میں ایک ہی جگہ ضروری مواد فراہم پاکر لائبریریوں میں

مبتدیوں کی تلاش و جستجو اور ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت سے بچ جائیگا۔

انتخاب نظم و نثر کے متعلق ملک کے سربر آوردہ ارباب فکر کے قیمتی مشورے اور خوش مذاق کارکنوں کا طریق کار اگرچہ کام کی عمدگی کی کافی ضمانت ہے۔ تاہم شروع سے لیکر آخیر تک کمزور انسانوں ہی نے اسے انجام دیا ہے اس لئے اسے "خطا و نسیان" سے کسی طرح مبرّا نہیں کہا جاسکتا۔ ابتدائے کار سے لیکر اسوقت تک ہمنے ہر مشورے کا کافی احترام کیا ہے اور چونکہ یہ کسی فرد واحد کا کام نہیں ہے اسلئے قدرتی طور سے بھی ضد و تعصب کی اسمیں گنجائش نہیں چنانچہ ہم کامل فراخدلی کیساتھ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ان مجلّدات کی طباعت و اشاعت کے بعد بھی موافق و مخالف دوست و دشمن کی کسی سمت سے جو معقول صدائے اصلاح اُٹھیگی اسکا کمال مسرت کیساتھ خیر مقدم کیا جائیگا اور دوسرے ایڈیشن میں شکریہ کیساتھ اس کی تصحیح و تلافی کردی جائیگی۔

شعرا و مصنّفین کی تصاویر اور ان کے حالات کی فراہمی میں بھی حتی الوسع ہم نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا مگر جو التزام و اہتمام ہمارے پیش نظر تھا وہ افسوس کہ خاطر خواہ انجام نہ پاسکا۔

گزشتہ شعرا و مصنّفین میں سے بعضوں کے حالات اور اُن کی تصاویر اگر میسر نہ آسکیں تو چنداں عجب نہیں لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ عصر موجودہ کے بعض بزرگوں کو بھی اپنے حالات و تصاویر دینے

میں مخل و مانل ہوا۔ خدا نخواستہ اسلئے نہیں کہ نامحرم نگاہیں اُن پر پڑینگی بلکہ انکسار کی بے کیف فرسودگی اور "میں کس قابل ہوں" کی رسم کہن کا یہی تقاضا تھا۔ حالانکہ اس سے کہیں بہتر عذر "عذر تساہل" ہے جو شان بے نیازی" کا بھی حامل ہے اور "شایانِ فطانت بھی تاہم اس باب میں ہماری کوششیں جس قدر بار آور ہو سکی ہیں وہ نذر ناظرین ہیں ؛

طباعت و اشاعت

اب ان مجلدات کی طباعت و اشاعت کا مسئلہ تھا جسمیں خوش آیند تصورات کے بجائے سرمایہ مالی کی ضرورت تھی اسکے لیے ہم میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور کی فراخ حوصلگی کے رہین منت ہیں جنہوں نے ان مجلّدات کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داریاں لیکر اردو ادب کی ایک عظیم الشان خدمت کا تہیہ کیا ہے۔ ان مجلدات کی اشاعت پر اب تک اس فرم کا پچاس ہزار روپیہ صرف ہو چکا ہے اس کے علاوہ ڈیڑھ سو مجلدات اور تیار ہیں جو وقتاً فوقتاً استعداد حالات کے مطابق شائع کیے جائینگے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اور کس قدر روپیہ صرف کرنا پڑیگا۔ یو۔ پی میں منشی نولکشور آنجہانی کی وہ مساعی جمیلہ جو خدمت اردو کے متعلق ہیں اپنی آپ مثال ہیں۔ لیکن میسرز عطر چند کپور کی فرم کا یہ تہیہ بھی اپنے مقام پر جسقدر حوصلہ افزا و قابل ستائش ہے وہ بھی شاید اُردو کی تاریخ میں فقید المثال ثابت ہو۔ انکا یہ کارنامہ یہ نہیں کہ

تجارتی کاروبار کے ضمن میں ایک عظیم الشان حوصلہ مندی ہے بلکہ وہ ایک اولو العزمانہ ملکی خدمت ہے جسے دراصل جریدۂ علم و ادب پر شہرتِ دوام کی مہر بنکر ثبت ہونا چاہیئے +

اُردو مرکز کا اسٹاف

ہم نے ذوق جستجو کو رہبر بنا کر ملک کے ان منتخب اہل قلم و انشا پردازوں کی خدمات حاصل کی ہیں جن پر اُردو دنیا بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اس گران قدر ادبی جماعت نے جس انہماک و شغف سے اُردو مرکز کے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیا اُس کا اعتراف نہ کرنا حد درجہ کی ناانصافی ہوگی۔ درحقیقت اردو مرکز عبارت اسی جماعت سے ہے ہماری دنیا سے تعلق رکھنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو ان حضرات کی قدر و منزلت سے واقف نہ ہو۔ ان کے اسمائے گرامی اس امر کی کافی شہادت ہیں کہ اُردو مرکز ملک کے بہترین انشاپردازوں کی ایک قابل فخر جماعت ہے +

فہرست کارکنان اُردو مرکز

۱۔ حضرت اصغر مصنف نشاط روح

۲۔ سید عابد علی بی۔ اے آنرز ایل۔ ایل۔ بی سلیڈیٹر ہزار داستان

۳۔ شیخ محمد ضیاء الدین شمسی جرنلسٹ

۴ - میاں تصدق حسین خالد ایم - اے *

۵ - مسٹر منوہر سہائے انور سہنسوانی جرنلسٹ *

۶ - پنڈت میلا رام وفا ایڈیٹر سوراجیہ *

۷ - مولینا حامد علی خان صاحب بی - اے *

۸ - حضرت فاخر ہریانوی بی - اے *

۹ - شبیر علی خان صاحب سرخوش مصنف تذکرہ اعجاز سخن *

۱۰ - شیخ عبداللطیف صاحب تپش بی - اے *

۱۱ - اصغر حسین خان صاحب نظیر لدھیانوی *

۱۲ - حضرت جگر مرادآبادی *

۱۳ - مولینا گویا جہان آبادی *

۱۴ - مولینا سیماب اکبرآبادی ایڈیٹر پیمانہ *

۱۵ - شیخ محمد ہادی حسین قریشی ایم - اے *

۱۶ - سردار اودے سنگھ شائق بی - اے - ایل - ایل - بی

۱۷ - مسٹر یوسف سلیم بی - اے

اُردو مرکز کی مجلس مشاورت

اُردو مرکز کے کاموں میں مسلسل طور پر مشورہ کی زحمت جن حضرات نے فرمائی اُنکی التفات بے پایان کا اعتراف بھی ہم صدق دل سے کرتے ہیں - یہ محترم حضرات صرف یہی نہیں کہ اپنا وقت عزیز پابندی

اردو مرکز کے منتخبات پر ناقدانہ نظر ڈالنے پر صرف کرتے رہے ہیں معیار انتخاب قائم کرنے میں اپنے زرّین مشوروں سے مسلسل طور پر ہماری امداد فرمائی۔ بلکہ اردو مرکز کے خلاف للّٰہی بغض رکھنے والی سازشی جماعت کے حملوں کے لئے ان کی مقتدر شخصیتّیں سدِّ سکندری ثابت ہوئیں۔

اراکین مجلس مشاورت

آنریبل خان بہادر سر شیخ عبد القادر بیرسٹر ایٹ لا۔ ریونیو ممبر ایگزیکیٹیو کونسل پنجاب

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ انسپکٹر آف ٹریننگ انسٹیٹیوٹس صوبہ پنجاب۔

پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفیؔ دہلوی (ادبی نقاد)

آخر میں ہم اس خدائے قادر و توانا کا شکر ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے نہاں خانۂ غیب سے ہمارے لئے یہ اسباب و وسائل فراہم کر دئے۔ اور اپنے لطف و کرم سے ہمیں بُری بھلی خدمتِ زبان کی توفیق عطا فرمائی۔ لیکن اُسی کی عادتِ جاریہ یہ بھی ہے۔ کہ وہ ہر اعلیٰ و صالح تحریک کے لئے مخالفین و مزاحمین کی بھی ایک جماعت تیار کر دیتا ہے۔ ورنہ پھر نہ تو کسی پُر مغز و مخلصانہ خدمت کی قدر و قوت کا اندازہ ہو اور نہ اُسے پوری طرح پھیلنے اور کامیاب ہونے کا موقع مل سکے۔

ہندوستان میں جہاں تعمیر کے مقابلہ میں شوقِ تخریب اور بڑھانے کے عوض نیچے گھسیٹنے کا جذبہ نسبتہً زیادہ ہے۔ ہم اِس سعادت سے کیونکر محروم رہ سکتے تھے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ اردو مرکز اپنی ناچیز خدمات کا کوئی عملی ثبوت پبلک میں پیش کرے بعض حلقوں میں اس کے متعلق پیشتر ہی سے چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ غالب نے کہا تھا ؎

ندانم تا چہ برق فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم
تصوّر کردہ ام بگستنِ بندِ نقابش را

یہاں بھی اردو مرکز اور اس کے کارناموں کا "گسستن نقاب" تو ایک طرف محض اُس کے تصوّر ہی سے ایک تلاطمِ اضطرار پیدا ہو گیا۔ اور گھبرا گھبرا کر ہمارے دوستوں کی نگاہیں اپنے اپنے ترکشوں پر پڑنے لگیں۔ چنانچہ اردو مرکز اور اُس کے اراکین کے متعلق پرائیویٹ صحبتوں کے علاوہ اخبارات و رسائل کے صفحات میں بھی مختلف رنگ اور مختلف عنوانوں سے تنقیص و تعریض کا شریفانہ عمل شروع ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری طرف سے "اشتراکِ عمل" کی دعوت عام تھی با ایں ہمہ بعض حلقوں میں اگر ایسی بے چینیاں موجود ہوں۔ جن کی بنیاد میں ناگفتہ بہ جذبات کارفرما ہیں۔ تو شاید ہماری اور اُن کی متفقہ کوششیں بھی انہیں زائل نہیں کر سکتیں۔ بہر حال ہمیں اور ہمارے دوستوں کو اپنا اپنا کام کرتے رہنا چاہئے۔ انجام کار کا فیصلہ اُسی خدا پر ہے۔ جس نے محسود کو حاسد پر۔ فراخ دلی کو تنگ نظری پر۔ تعمیر کو تخریب پر ہمیشہ فتح

پر ہے۔ جس نے محسود کو حاسد پر۔ فراخدلی کو تنگ نظری پر۔ تعمیر کو تخریب بیجا پر ہمیشہ فتح دی ہے اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ وہ ہم لوگوں کے لئے اپنے اس لازوال قانون میں تبدیلی ہرگز نہ کریگا۔

ہم اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں کہ جس خدا نے ہمارے لئے اسباب و وسائل مہیا کر کے ہمیں تھوڑے سے کام کی توفیق عطا فرمائی ہے اُسی نے ہمیں وہ صبر و سکون بھی (جو ہر کام کرنیوالے کے لئے ضروری ہے) مرحمت فرمایا ہے۔ ہم اپنی جانب سے کسی سے اُلجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور اپنے کرمفرماؤں کی تعریض و نکتہ چینی سے بھی (خواہ وہ کسی رنگ میں کیوں نہ ہو) صرف اپنی اصلاح و فلاح کا فائدہ اٹھانا چاہینگے اور بس ع

بادہ گر خام شود پختہ کند شیشۂ ما

تاجور چیف ایڈیٹر
اُردو مرکز لاہور

چمپا

(از ابو رشید مولینا عبد المجید صاحب سالک بی۔ اے)

۱

نارائن پرشاد کی اکلوتی بیٹی چمپا کے حسن کو شباب کی رعنائیوں نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اور وہ حسن و لیاقت کے اعتبار سے برادری بھر کی لڑکیوں میں ممتاز ہے۔ اس کی خوبصورتی کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ قصبے میں جب عورتیں کسی لڑکی کے حسن کی بہت تعریف کرتی ہیں۔ تو اُس کی انتہا یہ ہوتی ہے۔ کہ "یہ تو دوسری چمپا ہے"۔ چمپا نے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ اُس کے ماں باپ نے اپنی پیاری بچّی کو خود ہی ایسی با اصول اور عمدہ تعلیم دی ہے۔ کہ انتظام خانہ داری اور سینا پرونا تو خیر معمولی کام ہیں۔ زبان دانی اور علمی قابلیت میں بھی رابرٹ گرلز کالج کی کوئی لڑکی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی +

چمپا کی برادری کا دائرہ اس قدر تنگ تھا۔ کہ اُس کے بے نظیر حسن اور اعلےٰ درجے کی علمی لیاقت کو مدّنظر رکھ کر مناسب و موزون شوہر کا ملنا ایک امر محال تھا۔ بہت دوڑ دھوپ کی گئی۔ لیکن برادری میں کوئی ایسا لڑکا نظر نہ آتا تھا جو چمپا کا حق دار ٹھیرے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ چمپا اس عمر کو بہت پیچھے چھوڑ گئی جس میں ہندو لڑکیاں عام طور پر بیاہی جاتی ہیں +

ضرور[illegible] کیا تھا۔ عزیز و اقارب اور ذات برادری کے لوگوں کو اچھا خاصا مضمون

ہاتھ آ گیا جہاں چار آدمی یا دو عورتیں اکٹھی ہوتیں۔ وہاں یہی چرچا ہوتا "دیکھو نارائن پرشاد نے جوان کنیا کو بٹھا رکھا ہے کس قدر ادھرم کی بات ہے"۔ کوئی ودیارتھی اپنے عالمانہ انداز میں فرماتے "ارے بھئی۔ یہ کل جُگ ہے۔ اس میں کسی کا دھرم ٹھیک نہیں"۔ کوئی اعتدال پسند جدید تعلیم یافتہ اُن جاہلوں کی تحسین حاصل کرنے کے لئے کہتا "اس میں شک نہیں۔ عورتوں کی تعلیم اچھی چیز ہے۔ اور اُن کے لئے مناسب بَر تلاش کرنے میں کوشش کرنا والدین کا سب سے بڑا فرض ہے۔ لیکن نہ اس قدر کہ لڑکی کی عمر بیت جائے۔ چودہ پندرہ برس سوچنے اور کوشش کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہیں"۔ کوئی کہتا "یہ لڑکی بیاہ نہیں کریگی جوگن بنے گی"۔ کوئی کہتا "نارائن پرشاد کا ارادہ ہے۔ بیٹی کو نرس بنائے اور ساری عمر کنواری رکھے۔ جبھی تو اتنا پڑھایا لکھایا ہے"۔ یہاں تک تو خیریت تھی غضب یہ تھا کہ بعض بد باطن اس معصوم دوشیزہ پر طرح طرح کے الزامات لگا لگا کر اپنے پارسایانہ اظہار تنفر کی تکمیل کرتے۔

۲

اسے اتفاق کہئے یا چمپا کے والدین کی خوش قسمتی کہ انہیں دنوں میں ڈاکٹر شری کانت کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ یہ ڈاکٹر تیس برس کا جوان آدمی۔ نیک دل۔ سادہ طبیعت خاموش متین۔ راستباز۔ عیوب سے اغماض اور خطاؤں سے درگزر کرنے والا شخص تھا۔ اس کی روز افزوں پریکٹس نے اُسے کچھ دولتمند بھی بنا دیا تھا۔

چمپا کے ماں باپ بھلا اس موقع کو کب ہاتھ سے جانے دیتے تھے۔ وہ آپس میں کہنے لگے "تیس برس کوئی زیادہ عمر نہیں۔ پہلی بیوی سے بچے بھی کوئی نہیں۔ چار پانسو روپے ماہوار کی آمدنی ہے۔ کیا بُرا ہے؟"

بر ملنے کا انتظار کرتے کرتے اٹھارہ برس گزر گئے۔ بر آخر انسان ہی ہوگا آسمان سے فرشتے تو آنے سے رہے۔"

ہندوستانی والدین لڑکیوں کے معاملات میں بعض اوقات فاش غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ اگر ایک چھوٹی سی جاہل لڑکی کو محض روپے کی خاطر یا برادری و قرابت داری کے لحاظ سے کسی آدمی کے ساتھ بیاہ دیا جائے۔ تو یہ اتنا بڑا گناہ نہیں۔ کیونکہ ہندوستانی عورت کے نزدیک شوہر کا مرتبہ بہت بڑا ہے اور وہ ہوش سنبھالنے کے وقت ہی سے اُسے اپنے سر کا تاج گھر کا بادشاہ اور مجازی خدا سمجھنے لگتی ہے۔ اور چونکہ دیر تک یکجا رہنے سے اُس کی طبیعت اپنے شوہر کے مزاج میں مل جاتی ہے۔ اس لئے وہ غلامی کی گراں بار زنجیروں کے بوجھ کو محسوس بھی نہیں کرتی۔ لیکن جب لڑکی کو اعلےٰ تعلیم بھی دی اُس میں اعزاز نفس کا عزت افروز جذبہ بھی پیدا کیا۔ اپنی جائز خواہشات کا احترام کرنا بھی سکھایا۔ اس کی پرورش بھی حریت رائے اور آزادیٔ خیال کی آب و ہوا میں کی اور ان تمام باتوں کے بعد بھی معاشرت کے ظالمانہ برتاؤ سے اس قدر متاثر ہونا۔ کہ جو پہلا آدمی ملا۔ لڑکی اس کے حوالے کر دی۔ کس قدر افسوسناک طرز عمل ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر شری کانت چمپا کے والدین کی نظروں میں چمپا کا اچھا اور مناسب بر ہو۔ لیکن اُس کے بھدے سادے ڈھنگ۔ رُوکھی پھیکی باتیں۔ بڈھوں کی سی متانت و سنجیدگی بھلا اُن سے ایک سترہ اٹھارہ سال کی نوجوان تعلیم یافتہ لڑکی کے شیدائے تخیل اور چلبلے دل کو کیونکر مسرت و اطمینان نصیب ہوتا۔

پھنسے پر کیا پھڑکنا۔ اب تو جو پڑی۔ وہ چمپا اُٹھائے گی۔ لیکن اتنی بات ہے کہ اُس کی نازک و حساس فطرت اس نا"... بار غم کے

کے نیچے مظلومانہ دب گئی۔ اس کی وہ سب خوشنما امیدیں جنہیں وہ عرصے سے اپنے ارمانوں بھرے دل میں لئے بیٹھی تھی۔ جل کے خاک ہوگئیں۔ اور اُن کی جگہ آیندہ زندگی کی تاریکی و نامُرادی کا داغ باقی رہ گیا۔

۳

چمپا کی شادی خانہ برباری کو چھ مہینے گزُر چکے ہیں۔ لیکن اُس کے دل سے شکیب و قرار کوسوں دُور ہے برسات کا موسم ہے۔ گھٹائیں جھُوم جھُوم کر آتی ہیں۔ بادل گرج گرج کے برستے ہیں۔ مگر چمپا کے دل میں اُمنگیں نہیں اٹھتیں۔ پودے شاداب ہو رہے ہیں۔ پھُول کھل رہے ہیں۔ مگر چمپا کی کلی نہیں کھلتی۔ چمپا کمرے کے اندر صوفے پر لیٹی ہوئی نہایت تکلیف دِہ خیالات میں مستغرق ہے۔ "پرماتما اس طرح کیونکر کٹے گی؟ یہ زندگی نہیں مصیبت ہے۔ تو کبھی راحت کے دن بھی آئیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اچھا اگر نہیں آسکتے۔ تو کہیں موت ہی آچکے۔ دنیا مرتی ہے۔ پھر میں بدنصیب کس لئے زندہ ہوں —— دروازہ کھُلنے سے سلسلۂ خیال ٹوٹ گیا۔ نگاہ اُٹھا کر دیکھتی ہے کہ ڈاکٹر شری کانت اپنے ساتھ ایک خوبصورت نوجوان کو لئے چلے آرہے ہیں۔ آتے ہی ڈاکٹر شری کانت نے کہا:۔

"چمپا! تم انہیں پہچانتی ہو؟ یہ تمہارے والد کے دوست نرندر بابو جج کے فرزند ہیں۔ ان کا نام جُگندر بابو ہے۔ یہ اسی ہفتے انگلستان سے بیرسٹری پاس کرکے آئے ہیں۔ میں ان سے آج پارٹی میں ملا تھا۔ انہوں نے تم سے ملاقات کی خواہش کی۔ اس لئے میں ساتھ لے آیا۔

چمپا نے مُسکرا کر نوجوان سے ہاتھ ملایا۔ اور پہچان لیا کہ یہ وُہی جُگو ہے۔ جس کے ساتھ میں بچپن میں مندر کے پاس پیپل کے سائے تلے کھیلا کر

میرے ہاں آتے ہی پتھر ہو گئی ۔ اُف خدایا مجھے معاف کر۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا"۔

چمپا بھی ڈاکٹر شری کانت کی طرح بلکہ اُن سے بھی زیادہ افسردہ تھی ۔ لیکن شجاعت ایثار ہندوستانی عورت کا خاصہ ہے ۔ چمپا نے عزم مصمّم کر لیا تھا ۔ کہ اس کی ازدواجی زندگی خواہ کتنی ہی ناگوار ہو ۔ لیکن وہ اپنے دل کو ہرگز آوارہ نہ ہونے دے گی ۔ مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرے گی ۔ اور زندگی کے طوفان میں چٹان کی طرح ثابت قدم رہے گی ۔ وہ اکثر اس امر کی کوشش کرتی ۔ کہ ڈاکٹر شری کانت میں کوئی دلفریبی ۔ کوئی رعنائی ۔ کوئی سرگرمی ۔ کوئی جذبات کا جوش خروش نظر آئے تو میں اپنے دل کو اس سے محبّت کرنے پر مجبور کروں ۔ مگر اس مٹی کے کھلونے میں کوئی ایسی بات دکھائی نہ دیتی تھی ۔

اسی اثنا میں وہ حُسن و تسخیر کا دیوتا جگندر آ گیا ۔ اور چمپا کے معصوم دل پر ڈورے ڈالنے لگا ۔ اس شکار کی طرح جو کسی جادوگر صیاد کی سحرکاری سے مسحور ہو کر جال کی طرف خود بخود کھنچا ہوا چلا آئے ۔ چمپا کو اسی سوزاں و فروزاں آگ نے اپنی طرف گھسیٹ لیا ۔ جس سے وہ بچنا اور محفوظ رہنا چاہتی تھی ۔ اس ناتجربہ کار نوجوان نے جو مغربی زندگی کے آزادانہ میل جول کا عادی تھا ۔ پہلے محبّت کی ۔ اور پھر محبوب بن گیا ۔ دنیا میں کونسا انسان ہے ۔ جسے نوجوانی کے عالم میں کوئی عورت چاہے ۔ اور اس کا پائے ثبات لڑکھڑا نہ جائے ۔ چمپا کی فسوں کار آنکھوں نے اُسے بے طرح کھینچا ۔ اور آخر وہ چمپا کی سخت خطرناک محبّت میں خراب و مبتلا ہو گیا ۔ ڈاکٹر شری کانت کی طویل غیر حاضری اس سونے پر سہاگہ تھی ۔ اور اب ان دونوں کے میل جول میں کوئی امر حائل نہ تھا ۔ "پیا گھر نہیں ۔ اور ہمیں کسی کا ڈر نہیں" ۔

۵

ایک دن چمپا اور جگندر بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آخر شام ہو گئی اس وقت ان دونوں کی گفتگو کا دلچسپ موضوع جگندر کی شادی کا مسئلہ تھا۔ جگندر نے کہا:۔

"مَیں تو اس لڑکی سے کبھی شادی نہ کروں جس سے مجھے محبت نہ ہو۔ بھلا تمہیں انصاف کرو۔ اگر کوئی جاہل و بدتہذیب لڑکی میرے سر منڈھ دی جائے تو کیا میری زندگی آرام سے گزر سکتی ہے"؟

چمپا۔ واہ یہ تو عجیب بات ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا۔ تو کیا تم عمر بھر کنوارے ہی رہو گے؟

جگندر۔ میرے خیال میں تو ناپسندیدہ شادی سے یہی بہتر ہے کہ سرے سے شادی ہی نہ کی جائے۔

چمپا۔ ہاں یہ سچ ہے۔ مگر ہمارے یہاں ہندوستان میں تو اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ طرفین کی طبیعتوں کا کچھ خیال نہیں کرتے۔

چمپا کو اپنی ناگوار حیات ازدواجی کا خیال ستانے لگا۔ اور اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ کہ اُس نے اپنی نامرادی کی نسبت اپنی گفتگو میں کچھ اشارہ سا کیا۔ جگندر جو اپنی ناپاک محبت کے اظہار کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ چمپا اپنی موجودہ حالت کی خود شاکی ہے۔ اپنے جذبات ضبط نہ کر سکا۔ اُس نے نہایت پُرشوق نظروں سے چمپا کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"اچھا اگر ہندوستان کی سوسائٹی ایسی ہی ہے۔ تو مَیں ہرگز شادی نہ کروں گا اور اپنی "محبوبہ" کی پرستش میں عمر کاٹ دوں گا"

یہ مؤثر فقرہ چمپا کے دل میں بجلی کی طرح سرایت کر گیا۔ اس کے خیالات

جونہاں خانۂ دل میں رہتے رہتے گھبرا گئے تھے۔ اس کے سینے میں قیامت برپا کردی وہ کہنے لگی "لیکن جگندر تمہارے ماں باپ تمہیں ہرگز ایسی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہ دیں گے"۔

جگندر "میرے ماں باپ؟ اُنہیں میری آیندہ زندگی سے کیا واسطہ"؟

چمپا "(آبدیدہ ہو کر) آہ! اگر ان کا کچھ واسطہ نہ ہوتا۔ تو رونا ہی کا ہے کا تھا"۔

یہ کہہ کر وہ خوف اور گھبراہٹ سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

جگندر۔ (ذرا آگے بڑھ کر) پیاری چمپا۔ میں تمہاری مصیبت کو خوب جانتا ہوں۔ مجھ سے دل کی بات نہ چھپاؤ۔ جب تم مجھے زرد رُو اور مصیبت زدہ نظر آتی ہو۔ تو خدا گواہ ہے میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ دیکھو ہاتھ نہ کھینچو۔ پیاری تم جانتی ہو۔ میں تمہیں خوب جانتا ہوں۔ میں تو تم پر جان دیتا ہوں! ——— (بڑھ کر چمپا کی گردن میں ہاتھ ڈال دیتا ہے)۔

چمپا جگندر کے تلاطم جذبات سے گھبرا ... اور بولی "ہٹو۔ ہٹو جگندر۔ عقل سے کام لو"۔

جگندر "دیکھو ظالم خدا کے لئے ظاہرداری کی باتیں نہ کر۔ ہم دونوں نے کافی عرصے تک الفت کا راز چھپایا ہے۔ میری پیاری چمپا میں خوب جانتا ہوں تو بھی مجھے دل سے چاہتی ہے۔

یہ کہہ کر جگندر اُٹھا۔ اور اُس نے چمپا کی کشمکش کے باوجود اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اور بہت زور سے لپٹا لیا۔ چمپا اُس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور وہ بوسہ لینے کی فکر میں تھا۔ لیکن چمپا نے اپنا چہرہ پیچھے ہٹا کے اپنے دونوں ہاتھ جگندر کے چہرے پر رکھ دیئے۔ اور اس طرح اُس کے ہونٹوں کو اپنے رخسار تک نہ آنے دیا۔

ہوس کی اس ناپاک کشاکش کے درمیان ایک انسان باہر اُسی کمرے کی کھڑکی کے پاس سے گزرا۔ مگر چمپا اور جگندر نے اُسے بالکل نہیں دیکھا۔ خوف زدہ لڑکی نے جگندر کے آغوشِ تنگ سے مخلصی پا کر اپنی خودداری کو بحال کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ایک زخمی پرندے کی طرح لرزاں اور چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "دیکھو جگندر تم کیا کر رہے ہو؟ تم بڑے جلد باز ——— نہ توبہ بہت بُرے آدمی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں۔ میں دُوسرے کی بیاہتا بیوی ہوں"؟

اس کے جواب میں جگندر کچھ کہنے کو تھا۔ کہ باہر سے ڈاکٹر شری کانت کی آواز سُنائی دی۔ جو نوکر سے باتیں کر رہے تھے۔ جگندر تو جھٹ اٹھا۔ اور ٹوپی سر پر رکھ کر روانہ ہو گیا۔ اور چمپا فوراً اپنے بال اور کپڑے جو اس حیوانی کشمکش میں پریشان بے ترتیب ہو گئے تھے۔ درست کرنے کے لئے آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ کانپتے ہاتھوں سے اپنے آپ کو درست کیا۔ اور بادلِ ناخواستہ ڈاکٹر کے استقبال کو باہر آئی +

۶

اس واقعہ کے بعد ڈاکٹر شری کانت کی طبیعت بالکل بدل گئی۔ وہ ہمیشہ خاموش و افسردہ رہتے۔ اور اپنے دوستوں سے بھی کم ملتے۔ لیکن چمپا کے ساتھ وہ پہلے سے بھی زیادہ لاطفت اور محبّت سے پیش آنے لگے۔ اب وہ گھر پر بہت کم رہتے۔ نواحی علاقے میں پلیگ زور سے پھیل رہی تھی۔ اس لئے وہ دن رات اپنے کام میں مصروف رہتے تھے +

جگندر کے دیروزہ برتاؤ سے چمپا اس قدر متاثر ہوئی۔ کہ وہ دُوسرے دن تنہا اس کے سامنے جانے سے ڈرتی تھی۔ اس نے ناسازیِ طبع کا بہانہ کر کے ڈاکٹر صاحب سے ایک ہفتے کی اجازت لی اور میکے چلی گئی۔ تاکہ اپنی ماں اور گھر

کی دوسری عورتوں میں رہ کر وہ جگندر کی ملاقات سے محفوظ رہے۔ میکے میں بھی اُسے اطمینان خاطر میسر نہ تھا۔ سارا سارا دن اُس کا دل عجیب و غریب مخمصوں میں گرفتار رہتا تھا۔ ایک طرف شری کانت کے اخلاقِ حسنہ۔ راستبازی۔ پابندئ فرض اور روز افزوں التفات کا خیال آتا تھا۔ تو دوسری طرف اُس ظالم بیرسٹر کی حسین شکل صورت۔ اس کی شگفتہ مزاجی اور لطیفہ گوئی اپنی جانب کھینچتی تھی۔ سارا سارا دن اور رات رات بھر وہ بدبخت لڑکی اسی کشاکش خیال میں بسر کرتی تھی۔ آخر ہفتہ ختم ہوا۔ وہ اپنے گھر واپس آئی۔ اُن دنوں اس کے دل و دماغ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بعض اوقات اُسے یقین ہو جاتا تھا۔ کہ مجھے مالیخولیا اور اختلاج قلب دونوں امراض لاحق ہونے والے ہیں +

ایک دن ڈاکٹر شام سے پہلے ہی گھر آگیا۔ اور اُس نے چمپا کی بیتابی و بیقراری کو محسوس کیا۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اگر اُن کے تعلقات اجازت دیتے تو وہ اُٹھ کر اُسے گلے لگا لیتا۔ اور محبت کے جذبات سے مغلوب ہو کر سب گزشتہ واقعات بھول جاتا۔ لیکن آہ دلی تعلق منقطع ہو چکا تھا۔ وہ اب اس کے لئے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی تھی۔ وہ خوب سمجھتا تھا۔ کہ مَیں اس کے لائق نہیں۔ اور یہ اب میرے لائق بھی نہیں +

وہ دونوں آپس میں پلیگ کی حالت پر باتیں کرنے لگے۔ شری کانت نے مریضوں کی تکلیف۔ اُن کے اعزہ کی مصیبت اور تمام آبادی کے متوحش ہونے کا ذکر بہت دردناک پیرائے میں کیا۔ اس دن چمپا نے پہلی دفعہ اپنے شوہر کے دل کی شرافت و دردمندی کا کچھ اندازہ لگایا۔ اور معلوم کیا۔ کہ یہ محض سنگ مرمر کا بُت ہی نہیں بلکہ سینے میں احساس کی حرارت بھی رکھتا ہے۔ وہ موچتا کہنے لگی:۔

اس وقت

"تو تم ایسے طاعون زدہ علاقے میں کیوں جایا کرتے ہو۔ یہ بات تو بہت خطرناک ہے"۔

ڈاکٹر: "ڈاکٹروں کو کیا خطرہ ہے"۔

چمپا: "مگر آخر ڈاکٹروں کو اپنی جان تو بچانی چاہیئے"۔

ڈاکٹر: "چمپا۔ جان اور زندگی وغیرہ کی نسبت میرے خیالات عجیب ہیں میں زندگی کو بالکل بے حقیقت سمجھتا ہوں۔ زندگی اس شخص کے لئے البتہ قیمتی چیز ہے۔ جسے دنیا میں مسرت نصیب ہو۔ اور اُسے چھوڑ نہ سکے لیکن میں جسے کوئی بھی خوشی میسر نہیں۔ موت سے کیوں ڈروں۔ میرے جیسے لوگوں کے لئے موت ہی زندگی ہے"۔

رنج و مایوسی کے یہ پہلے الفاظ تھے۔ جو ڈاکٹر کے منہ سے بے اختیار نکل گئے اس کے چہرے کی متانت بدستور تھی۔ نظریں سودائیوں کی طرح فرش پر ایک جگہ گڑی ہوئی تھیں۔ اور خیالات خدا جانے کدھر اُڑے جا رہے تھے۔

غریب سادہ لوح لڑکی پر اس نیک دل انسان کے رنج کا بہت اثر ہوا۔ اور وہ بے اختیار رونے لگی۔

ڈاکٹر: "ہیں۔ پیاری چمپا کیوں تمہیں کیا تکلیف ہے (اس کا ہاتھ تھام کر) اوہو! تمہیں تو حرارت سی معلوم ہوتی ہے۔ اٹھو بستر پر لیٹ جاؤ۔

اس سے ایک گھنٹہ بعد حسب معمول جگندر صاحب بہادر ایک نہایت ہُوٹ پہنے تشریف لائے ان کو کسی طرح چمپا کے میکے سے واپس آنے گئی تھی۔ اُنہیں امید تو یہ تھی کہ میری عاشق زار چمپا خود میرے استقبال اس کی جگہ وہ کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ڈاکٹر شری کانت چلے آرہے

ہیں۔ اور اُن کے چہرے پر معمول سے زیادہ متانت برس رہی ہے۔
جگندر نے آگے بڑھ کر پوچھا "کیا مسز شری کانت اندر ہیں؟" یہ سوال جگندر نے کچھ ایسے انداز سے کیا۔ گویا مسز شری کانت کا وہی واحد مالک و مختار ہے۔

ڈاکٹر۔ ہاں وہ اندر رہی ہیں۔ لیکن بیمار ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں پلیگ ہوگئی۔

جگندر۔ (خوف زدہ ہوکر) پلیگ! یعنی ——— یعنی بیوبانک پلیگ؟ اوہو!

ڈاکٹر۔ جی ہاں۔ کیا آپ اُن سے ملیں گے؟ میرا خیال ہے کہ اس وقت آپ کی ملاقات سے انہیں بہت تسکین ہوگی۔

اب تو جگندر سٹپٹائے۔ نئے فیشن کے شیدا کے سامنے طاعون کے سے مرض متعدی کا نام لینا بس یُوں سمجھئے۔ کہ شیطان کے سامنے لاحول پڑھ دی۔ بیرسٹر صاحب بہت گھبرائے۔ آخر فرمایا "نہیں نہیں۔ لیڈیز کو بیماری کی حالت میں ڈسٹرب کرنا اٹیکیٹ کے خلاف ہے۔"

یہ کہا اور ڈاکٹر کو سلام کئے بغیر وہاں سے گھر پہنچے۔ اپنے سب کپڑے اُتارے اُن کو ڈِس انفکٹ کرایا۔ خود پانی میں فینائل ڈال کر غسل کیا۔ اور کوٹھے پر جاکر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ کہ پھیپھڑے خراب ہوا سے خالی ہو جائیں۔ جب بالکل تسلی ہوگئی۔ تو بانکے عاشق اپنی محبوبہ کا تصور جما کے سو گئے۔

۷

چمپا اسی خطرناک وبائی مرض میں مبتلا ہوگئی جس نے سارے شہر کو ہلا دیا تھا۔ مرض کا حملہ بہت سخت تھا۔ اور وہ بہت دنوں تک بچا۔

مبتلا رہی۔ کبھی چیختی۔ کبھی چلاتی۔ کبھی کپڑے پھاڑتی۔ ہر لحظہ یہی خطرہ تھا۔ کہ اب اجل کی ہوا آئی۔ اور اب یہ پھول مرجھایا۔ نوکر چاکر سب بھاگ گئے۔ اس کی تعلیم یافتہ ماں ایک دفعہ اس کی عیادت کو آئی۔ مریضہ کے بستر سے تین گز فاصلے پر بیٹھی۔ اور وہیں چار تسو نے بہا کر واپس چلی گئی۔ جگندر بابو صاحب نے بہت عنایت فرمائی۔ کہ ایک ملاقاتی کارڈ دریافت حال کے لئے ڈاک میں بھیجا۔

اس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں اگر کوئی چمپا کا خبرلیوا اور رہائی دیوار رہا۔ تو وہی اُس کا سادہ لوح۔ کوڑ مغز۔ سرد مہر۔ بے حس۔ غیر متاثر شوہر جس نے رات کی نیند اور دن کا آرام اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ وہ ایک ملازم ڈاکٹر کی طرح ہر وقت پاس موجود رہتا۔ اپنے ہاتھ سے دوا پلاتا۔ تھرما میٹر لگاتا۔ اور نبض دیکھتا۔ ایک باورچی کی طرح چمپا کا پرہیزی کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتا۔ ایک نرس کی طرح بستر کے پاس کرسی پر بیٹھ کر چمچے سے دودھ مریضہ کے منہ میں ڈالتا۔ اور اس کے کمرے اور بستر کی صفائی کا خیال رکھتا۔ چمپا کا قابل اعتراض چال چلن اور اس کی سب نارضامندیاں اُسے خواب فراموش ہو گئیں۔ اور صرف اپنے ادائے فرض کا خیال باقی رہ گیا۔

جن لوگوں نے کبھی پلیگ کا زور شور نہیں دیکھا۔ وہ اس عذابِ الٰہی کی خوفناک تباہی و بربادی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے خاندانوں کے سرپرست اُٹھ گئے۔ جن بچوں کو رات کے وقت ماں باپ نے محبت سے چوم کر اپنے ساتھ سُلایا تھا۔ وہ صبح کو جاگے۔ تو اپنے آپ کو یتیم پایا۔ سینکڑوں مصیبت زدہ لڑکیاں شادی کو ابھی چند دن بھی نہ گزرنے پائے تھے۔ بیوہ ہو گئیں۔ ضعیف و [illegible]گوں نے جن کی کمریں دُنیائے زندگی کی مصائب اور بڑھاپے کے [illegible]گئیں تھیں۔ اپنے جوان بیٹوں اور پوتوں کی نعشیں اپنے ہاتھ

سے دفن کیں۔ جانی دوست جو کبھی جاں نثاری و وفاداری کا دم بھرتے تھے۔
طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر اُڑ گئے۔ بعض لاوارث بدنصیب نعشوں کو کفن تک
نصیب نہ ہُوا۔ کسے اپنی زندگی بھاری تھی۔ جو جان ہتھیلی پر رکھ کر اُن کی تجہیز تکفین
کرتا۔ موت کے زبردست ہاتھ نے ساری آبادی کا صفایا کر دیا تھا۔ شہر بھر میں
ایک ہُو کا عالم طاری تھا۔ کبھی کبھی اُس ناشاد و نامُراد بڑھیا کے دل دوز بَین
کلیجہ ہلا دیتے تھے۔ جس کے سات جوان بیٹے طاعون کے خوف ناک دیوتا کی
بھینٹ چڑھ گئے۔ الاّمان والحفیظ !!

ایسے خطرناک زمانے اور اس بھیانک مقام میں صرف ایک شخص اپنی بیوی
بھی نہیں۔ نام نہاد بیوی کی عیادت میں دل و جان سے مصروف۔ فرشتے
اس پر رحمت کے پھُول برسا رہے تھے۔ اور آسمان کی ساری مخلوق اس کی
فتح و کامرانی کے لئے دعا کر رہی تھی!

آخر خدا نے شری کانت کی سُن لی۔ اور چمپا اچھی ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں
کھولیں تو پہلے پہل اپنے شوہر کا محبّت بھرا چہرہ دیکھا۔ جو بہت دنوں کی لگاتار
شبانہ روز محنت سے دُبلا ہو گیا تھا۔ اور آج اس میں مسرت و اطمینان کے
جذبات جھلک رہے تھے۔ چمپا نے ڈاکٹر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ مگر
وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس لئے ہاتھ نہ بڑھا سکی۔ اور آنکھیں بند کر کے
سو گئی +

دوسرے دن صبح جب ڈاکٹر نے اسے دوا کی پہلی خوراک دی۔ تو اُس۔
ڈاکٹر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے زرد ہونٹوں سے لگا لیا۔ ش
کے چہرے پر خون دوڑنے لگا۔ اگرچہ وہ بہت صابر اور ضبط
لیکن اسے اس قسم کی ظاہر داریاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھ

ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیا۔ لیکن مریضہ کی خبرگیری اور دوا درمن اسی سرگرمی سے کرتا رہا۔ اب اس کی گفتگو سے چمپا کو بہت حظ حاصل ہوتا تھا۔ اور وہ کان لگا کے غور سے سنا کرتی تھی۔ ڈاکٹر کی فطرت زندہ دل اور خودپسند جگندر سے بالکل مختلف واقع ہوئی تھی۔ جگندر اپنی گفتگو میں ہمیشہ صیغہ واحد متکلم کی شان میں قصیدہ خوانی کا عادی تھا۔ اس کے خلاف ڈاکٹر ساری دُنیا کا ذکر کرتا تھا اور نہ کرتا تھا تو اپنا۔ اس بے نفسی کے ساتھ ساتھ اُس کے سادہ اوضاع و اطوار کچھ ایسے دل نشیں تھے۔ کہ اب چمپا کو بھی دلچسپ معلوم ہونے لگے۔ دو مہینے سے چمپا کا شوہر اپنے تمام کام چھوڑ چھاڑ کر بیوی کی خدمت میں کمر بستہ تھا۔ اور اب بیوی کے خیالات بالکل بدل گئے تھے۔ جتنی وہ ڈاکٹر کی فطرت سے واقف ہوتی جاتی تھی۔ اُتنا ہی اُس کے دِل میں اُس کی عظمت کا نقش زیادہ روشن اور پائدار ہوتا جاتا تھا۔ آخر چمپا اس نتیجے پر پہنچی۔ کہ شری کانت ایک دیوتا ہے۔ قابل پرستش اور بوالہوس جگندر ایک شیطان تھا مجسّم!

ڈاکٹر شری کانت چمپا کے خیالات کی اس کایا پلٹ سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ اپنے آپ کو چمپا کی زندگی تلخ کرنے کا مجرم سمجھتے تھے۔ اور اُنھوں نے چمپا کی جان بچا کر گویا اپنے جُرم کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور بس۔ اس کے علاوہ وہ چمپا کے خیالات میں کسی قسم کی تبدیلی کے متوقع نہ تھے۔ اور نہ اس خیال سے انھوں نے اس کی خدمت کی تھی۔ کہ اس کے معاوضے میں چمپا اُن سے محبت کرے ÷

۸

صحت حاصل ہوتے ہی پھر بیرسٹر صاحب نے عنان توجہ اس طرف ڈاکٹر صاحب پھر غیر حاضر رہنے لگے۔ اب تو چمپا اُن کی

عدم موجودگی کو بہت فکر و تردّد کی نظر سے دیکھنے لگی لیکن اُسے ہمت نہ پڑتی تھی کہ سبب دریافت کرے۔ اسے اب جگندر کی بے باکانہ حرکتیں بہت بُری معلوم ہوتی تھیں۔ کیونکہ بعض اوقات وہ ڈاکٹر کے سامنے بھی چمپا کے ساتھ نامناسب بے تکلفی سے پیش آیا کرتا تھا۔

ایک دن چمپا اور جگندر دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ چمپا تو گزشتہ واقعات کو بھول جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن جگندر رسم اُلفت از سرِ نو تازہ کرنا چاہتا تھا۔ شاید وہ اس وقت کو بھول گیا تھا۔ جب ہیگ کا نام سُنتے ہی اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اور وہ اُلٹے پاؤں گھر واپس بھاگا تھا لیکن چمپا کو وہ واقعہ خوب یاد تھا۔ جگندر نے چمپا سے کہا۔ "پیاری چمپا۔ اگر تم مر جاتیں تو میں کیا کرتا۔ اُف میری ساری زندگی تباہ ہو جاتی محبت کے بغیر زندگی بے رُوح ہے"۔

چمپا اس کے شاندار مگر بے معنی فقرے سُن کر حقارت سے مُسکرائی۔ اور مُنہ پھیر کر خاموش ہو گئی۔ جگندر نے بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ چمپا نے چھڑانا چاہا۔ مگر کمزوری کی وجہ سے نہ چھڑا سکی۔

چمپا۔ چھوڑ دو۔ جگندر میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ میں اب وہ نہیں ہوں۔

جگندر۔ نہیں نہیں میری پیاری خدا کے لئے ایسی دل شکن باتیں نہ کرو۔ میں کس طرح یقین کر لوں۔ کہ اب تم کچھ اور ہو گئی ہو؟ میں جانتا ہوں تم ضرور مجھے چاہتی ہو۔

یہ کہہ کر اُس نے چمپا کے ہاتھوں کو چُومنا شروع کر دیا۔

بس پھر کیا تھا۔ چمپا کو سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ اُس نے سوچا کہ اِس ہتک آمیز تعلق کو یک لخت منقطع کر دینا چاہئے۔ خدا جانے اس وقت

اس میں کہاں سے طاقت آگئی۔ کہ اُس نے جھٹ اپنا ہاتھ کھینچ کر چھڑا لیا
غصہ و غیرت کے جوش سے اس کا دماغ بے قابو تھا۔ وہ ہمت کر کے
اُٹھی۔ تاکہ اس گستاخ شخص کو نسوانی خودداری کی توہین کا مزا چکھلائے اُٹھتے
ہی اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ تو صحن میں اُس کا شوہر ادھر اُدھر
ٹہل رہا تھا۔ ڈاکٹر شری کانت نے اب بھی اور اس سے پہلے دو موقعوں
پر بھی جگندر اور چمپا کی سب حرکتیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھیں۔ اور
اب بدگمانی نے اُسے یقین دلا دیا۔ کہ ان دونوں کے باہمی تعلقات
سخت قابلِ اعتراض ہیں۔ اب چمپا کو بہت شرم آئی۔ اور اُس کے
شرمندہ بُشرے نے اُسے اور بھی مجرم ثابت کر دیا۔ وہ اپنے جرم کو بہت سنگین
سمجھتی تھی۔ اور خوب جانتی تھی کہ ڈاکٹر نے ایسے مشتبہ نظارے دیکھ کر دل میں
کیا خیال کیا ہوگا۔ چمپا اپنی نظروں میں خود ذلیل ہو رہی تھی۔ وہ اپنے اس نیک
شوہر کے حق میں بے وفا ثابت ہوئی تھی۔ جس کا خاموش اور بہادرانہ ایثار
اِس کی مجرمانہ زندگی پر ہزار لعنت برسا رہا تھا ؂

چمپا نے اس مصیبت کی حالت میں بھی جگندر سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر
احساساتِ غم کی شدت سے مغلوب ہو کر صرف ایک چیخ ماری[1] اور بیہوش ہوگئی
غش کے ساتھ ہی نیند آگئی۔ اور جب صبح کو اُس کی آنکھ کھلی۔ تو بادِ سحر کے
ہلکے ہلکے جھونکوں سے کھڑکیوں کے پردے ہل رہے تھے۔ اسے کل کا واقعہ
یاد آیا۔ وہ کانپ اُٹھی۔ اور گردن پھرا کر اپنے شوہر کے بستر کی طرف دیکھا
تو اُس پر کسی کسائی بے شکن چادر بچھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب
رات اِس پر نہیں سوئے۔ پریشان ہو کر اُٹھی۔ دفعۃً خیال آیا۔ کہیں میرے

[1] شاعرانہ مبالغہ ؂

دیوتا میری بے وفائی اور گنہگاری پر ناراض ہو کر مجھے چھوڑ تو نہیں گئے۔ ہائے ایشور اب میں کیا کروں گی"۔

اس کے دل میں بہت سے نامبارک خیالات آئے۔ اور وہ اٹھی۔ دروازہ کھولا۔ تو دوسرے کمرے میں خوفناک تنہائی کا تسلط تھا۔ وہاں سے بھاگی۔ ڈاکٹر صاحب کے کتب خانے میں آئی۔ وہ بھی اسی طرح ویران پڑا تھا۔ اب چمپا کی حالت غیر تھی۔ اُس نے ڈاکٹر کو پکارنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکی۔ گلا خشک ہو گیا تھا۔ اور زبان تالو سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ آخر نیچے اُتری۔ نوکر کو آواز دی۔ اور ڈاکٹر کا پتہ پوچھا۔ اُس نے کہا "حضور وہ آدھی رات کے وقت اپنا پورٹ منٹو اٹھا کر خدا جانے کہاں چلے گئے۔ یہ ایک لفافہ دے گئے تھے"۔

چمپا نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ بڑی مشکل سے خط نکالا۔ خط کا مضمون یہ تھا:۔

جان سے پیاری چمپا۔

مَیں تمہیں بہت چاہتا تھا۔ اور میں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسی کو قرار دیا تھا۔ کہ تمہیں خوش رکھوں لیکن بدقسمت ہوں کہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ اب ہمیشہ کے لئے جاتا ہوں۔ تم جو چاہو کرو۔ جس سے چاہو ملو۔ جہاں چاہو جاؤ تم مختار ہو!

تمہارا بدقسمت شوہر
شری کانت (۱۲ بجے شب)

یہ خط پڑھ کر چمپا سر سے پاؤں تک سُن ہو گئی۔ رنگ زرد ہو گیا۔ دل زور سے دھڑکنے لگا۔ رُوح کھوئی ہوئی محبت کو تلاش کرنے لگی۔ درد و اضطراب کے عالم میں خیالات کا ہجوم ہونے لگا۔ ہائے جب میں نے اپنے سوامی کو چاہنا شروع کیا تو وہ چل دیا؟ صرف اسی لئے مرنے چلا گیا۔ کہ مَیں خوش رہوں؟ نہیں یہ ہرگز نہیں

ہوگا۔ یا تو مَیں اسے واپس لاؤنگی۔ یا خود اُس کے قدموں پر جان دُوں گی۔ وہ آئے گا۔ اور مَیں جب تک جیُوں گی۔ اُس کی سچی پجارن بن کر رہوں گی۔ اُس کی خدمت میرا سب سے بڑا فرض ہوگا۔ اور اسی کو چاہنے میں میری نجات ہوگی۔ وہ کہاں گیا ہوگا؟ مَیں کہاں جاؤں؟ وہ مجھ سے اکثر اس پلیگ کمپ کا ذکر کیا کرتا تھا۔ جہاں طاعون کے غریب و بے خانماں مریض جمع کئے جاتے ہیں۔ اُف وہاں تو اب سے پہلے دس ڈاکٹر گئے۔ اور طاعون کا شکار ہو گئے۔ اب تو ڈر کے مارے کوئی نہ جاتا تھا۔ تو شری کانت صرف مرنے گئے ہیں؟ ہائے میرے دیوتا نے مجھے آزاد کرنے کی غرض سے موت قبول کی۔ ہائے میرے شری کانت! میرے دیوتا۔ میرے سوامی۔ تمہاری خود غرض اور گنہ گار لونڈی اس قدر ایثار کی مستحق نہ تھی!!

(۔ تحریرا)

چمپا اپنے کمرے میں آئی۔ خوبصورت ریشمی ساڑی اتار ڈالی۔ اور اُس کی جگہ ایک سفید دھوتی باندھ لی اپنے ایک بُوڑھے ملازم کو ساتھ لیا۔ اور گاڑی میں سوار ہو کر پلیگ کمپ کو روانہ ہوئی۔ وہ مقام چمپا کے مکان سے بہت دُور تھا۔ گاڑی شام کے وقت وہاں پہنچی۔ چمپا اُتری۔ پُوچھا ڈاکٹر صاحب کا خیمہ کہاں ہے؟ لوگوں نے پتہ بتایا۔ تیر کی طرح وہاں پہنچی۔ آتشِ شوق تیز ہو رہی تھی۔ اور چمپا سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ کچھ تامل کے بعد وہ اُس خیمے کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر شری کانت دروازے کی طرف پُشت کئے اپنی کرسی پر بیٹھے تھے۔ دونوں کہنیاں میز پر رکھی تھیں۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے گردن جُھکائے ٹھنڈے سانس لے رہے تھے۔ کونے میں ایک چھوٹا سا لمپ جل رہا تھا۔ اور اُس کی دھندلی اور غم آمیز روشنی کمرے کی چیزوں پر پڑ رہی تھی۔

چمپا میں بولنے کی ہمت نہ تھی۔ حیا بھی مانع آتی تھی۔ اور اپنی گنہ گاری کے خیال نے تو بالکل بے قابو کر رکھا تھا۔ آخر اُس نے آہستہ سے کہا:۔

"سوامی!"

پہلی آواز پر تو ڈاکٹر نے یہی سمجھا۔ کہ تخیل بھی مجھ مصیبت زدہ سے دل لگی کر رہا ہے اور میرے تصوّر کے کانوں میں وہی محبوب آواز گونج رہی ہے۔ جب چمپا نے دوسری آواز دی۔ تو ڈاکٹر نے دفعتہً پیچھے مڑکر دیکھا۔ کہ اُس کی بیوی چمپا سفید ساڑی باندھے فرشتہ بنی کھڑی ہے۔ کھڑا ہوگیا اور پوچھنے لگا:۔

"چمپا! تم یہاں کہاں؟"

چمپا۔ سوامی۔ تم جہاں جاؤ گے۔ مَیں بھی وہیں رہوں گی۔

شری کانت (منہ پھیر کر) نہیں نہیں چمپا۔ تم جاؤ۔ میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا۔ تم میرے ساتھ مصیبت میں رہ کر اپنی دُنیا اور میری عاقبت خراب نہ کرو۔ جاؤ۔ چلی جاؤ!

چمپا۔ (روکر) میرے سوامی! میرے ناتھ! مجھے یوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ مجھے معاف کرو۔ مَیں اپنے تصوروں کا خمیازہ بھگت چکی ہوں میں نے گناہ کیا اور سزا پائی۔ دیکھو میرے پیارے دیوتا۔ میری توبہ قبول کرو"

بس یہاں پہنچ کر چمپا کی طاقت نے جواب دے دیا۔ اور وہ ڈاکٹر کے کانپتے ہوئے بازوؤں پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر نے اُس کو لٹا کر ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کیں۔ پانچ منٹ کے بعد چمپا نے آنکھیں کھولیں۔ حسرت بھری نگاہیں ڈاکٹر کی طرف پھیریں۔ اور دونوں کمزور ہاتھ جوڑ کر اپنے سوامی کے قدموں میں گر گئی۔ چمپا رخصت ہوئی۔ اُس کا زرد اور خوبصورت چہرہ سفید ساڑی میں چاند کی طرح چمک رہا تھا!

ڈاکٹر شری کانت اس حادثہ سے بالکل پتھر ہو گئے۔ کبھی انہیں چمپا اور جگندر کی شرمناک ہم آغوشی یاد آتی تھی۔ اور کبھی چمپا کا خود اُن کے قدموں پر گر کر جان دینا نظروں کے سامنے پھرتا تھا۔ غرض دل و دماغ عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ اور قریب تھا کہ خیالات کے ہجوم اور وفورِ غم سے ڈاکٹر شری کانت پاگل ہو جائیں۔ دوسرے ہی دن انہیں بخار ہوا۔ ساتھ ہی گلٹی بھی نمودار ہوئی دو تین گھنٹے کے بعد وہ مضبوط۔ طاقتور اور مستقل مزاج جوان ڈاکٹر جس نے سینکڑوں کو موت کے خوفناک پنجے سے چھڑایا تھا۔ خود صیادِ اجل کے تیر بے پناہ کا شکار ہو گیا۔

(کہکشاں)

طلسم

(از برگیڈ میجر میاں عطاالرحمٰن صاحب بی۔ اے۔ رام پور)

مگر جی نے دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور جیب میں سے ایک اخبار کا کاغذ نکال کر چہرے کو ہوا دینے لگا۔ گرمی کے موسم میں دوپہر کے وقت چلچلاتی ہوئی دھوپ میں کلکتہ کی ایک سڑک پر رستہ چلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی نے ہوا کو چاروں طرف سے بند کر کے زمین کے نیچے آگ جلا دی +

چھتری لگائے ہوئے اور سر کو نیچا کئے ہوئے اس عجیب صبر کے انداز سے جو بنگالی قوم کی خصوصیت ہے وہ چلا جا رہا تھا۔ کہ ایک دفعہ سر اٹھانے پر اس کی نظر ایک کتب فروش کی دکان کے باہر ایک اخبار کے پوسٹر پر پڑی "انجن ڈرائیور لکھ پتی ہو گیا" اور اس کے نیچے "مصر کی پرانی قبور کے خزانے" لکھا ہوا تھا +

اس کے چہرے پر ایک ملال آمیز مسکراہٹ کا اظہار ہوا۔ اور اس کے منہ سے نکلا "اپنی اپنی قسمت ہے"۔ لیکن وہ مسکراہٹ ہونٹوں سے زیادہ دور نہ گئی۔ دفتر کی کرسی پر پانچ چھ گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد کوئی نہایت پرلطف واقعہ ہونا چاہیئے تھا جس سے اس کو ہنسی آتی۔ علاوہ ازیں اس نے صبح سے کچھ کھایا نہ تھا۔ اور اپنی غریبانہ جائے رہایش پر پہنچنے کے لئے

ابھی اسے قریباً دو میل سفر اور طے کرنا تھا۔

تاہم ان اخباری خبروں نے اس کے دل میں ایک عجیب قسم کی حرکت پیدا کردی۔ اپنی عمر کے چونتیس سالوں میں اسے ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی۔ کہ اس کے ساتھ ایسے واقعات گذریں جو کسی اور کے ساتھ نہ گذرے ہوں۔ اس کی طبیعت ایک سیاح کی مانند تھی۔ اور اُس کے جذبات وہی تھے لیکن اتنی طاقت نہ تھی کہ ان کو پورا کرنے کے لئے وہ کوئی عملی کارروائی کر سکتا۔ اپنے ان خیالات کا اُس نے آج تک کسی سے اظہار نہ کیا تھا۔ اور اپنی بیوی تک کو ان خیالی گھوڑوں کی شکل نہ دکھائی تھی جو وہ دوڑانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ بیچاری سیدھی سادھی دنیادار عورت تھی۔ اور اس کے چولھے کے سامنے بیٹھ کر مچھلی اور بھات کے پکنے کی خوشبو کے مقابلہ میں غروب آفتاب کے وقت زنگار رنگ بادلوں کے ہوائی قلعے بنانے کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ لیکن مکرجی کے دل میں یہ یقین تھا کہ خواہ اُسے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے آخر کبھی وہ دن ضرور آئیگا جب . . . .

اپنے مکان پر پہنچنے کے لئے ابھی اُسے ایک میل اور جانا تھا کہ یک لخت اس کی نگاہ ایک پرانے عجائبات بیچنے والے کی دکان پر پڑی۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ شائد وہاں سے بغیر کسی احساس کے گذر جاتا۔ لیکن آج اس کھلی ہوئی کھڑکی نے اس پر وہ اثر کیا جو طوفانی سمندر کی اندھیری رات میں جہازراں پر یکایک "لائٹ ہوس" کی روشنی نظر آجانے سے ہوتا ہے۔

مکرجی بے اختیار سا ہو کر کھڑکی کے سامنے ٹھیر گیا اور پیتل اور چینی کی بنی ہوئی مختلف چھوٹی بڑی چمکدار اشیاء پر نگاہ دوڑانے لگا جو وہاں رکھی ہوئی تھیں۔ اپنے آپ پر جبر کر کے وہ وہاں سے گذر جانے کو تھا۔ کہ اُس

کی آنکھیں کھڑکی کے بائیں کونے میں ایک سنگ یشب کے بنے ہوئے چھوٹے سے سبز بت پر جم گئیں۔ اس بت میں کوئی عجیب بات نہ تھی۔ اور نہ وہ کچھ زیادہ قیمتی ہی نظر آتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ مکرجی جبراً اپنی نگاہ اس پر سے ہٹا لیتا تھا۔ وہ پھر بے اختیار اُدھر ہی کو چلی جاتی تھی۔ اس بت کے چہرے پر ایک نئی قسم کی مسکراہٹ سی تھی! اور اس کی آنکھیں تمام کائنات کو دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں بے حد عقل دُور اندیشی راز۔ تخیل۔ اور اُداسی پنہاں تھی۔ اور انسانی علم سے بہت بڑھا ہُوا علم موجود تھا۔ ہاں۔ یہی آنکھیں تھیں جو اُس گرمی سے بوکھلائے ہوئے انسان کو جو کھڑکی سے باہر کھڑا دیکھ رہا تھا دکان کے اندر کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ اس بنجر نے اپنی عمر کے چونتیس سال مدرسے کی تعلیم کے مدارج مزدوروں کی طرح طے کرنے کے بعد کلرکی کے میز پر خشک اور بے لطف مضامین نقل کرنے میں نہیں گذارے تھے۔ اس کی حدِ نگاہ انسانی حدِ نگاہ سے لاکھوں کوس دُور تھی۔ اور اس کے سینے میں خدا جانے کیا کیا بھید بھرے ہوئے تھے۔ غیر ممکن نہ تھا کہ اس میں ایسے اثرات بھی ہوں جن سے اس کا مالک بھی متاثر ہو سکے +

دفعتہً مکرجی کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی۔ وہ اس چھوٹے سے دیوتا کا مالک بننا چاہتا تھا۔ خواہش گو مجنونانہ تھی لیکن زبردست تھی۔ وہ اس کو ضبط نہ کرسکا اور دروازہ کھول کر دکان میں داخل ہو گیا +

"مجھے وہ چھوٹا سا بت دکھاؤ۔ یہ جو کھڑکی میں رکھا ہوا ہے"

یہ فقرہ جھجکتے ہوئے انداز میں اُس نے اس بڈھے چینی دکاندار سے کہا جو دکان کے عقبی حصے سے دروازہ کھلنے کی آواز سُن کر نکل آیا تھا۔

اُس نے اس کم حیثیت بابو کی شکل دیکھ کر اندازہ کیا کہ یہ ایسی چیز کہاں خریدے گا۔ اور دوپہر کے وقت مزے کی نیند میں سے اٹھائے جانے کی وجہ سے اس کی طبیعت زیادہ باتیں کرنے کی طرف راغب بھی نہ تھی۔ اس نے کہا "تو کیا باہر کھڑکی میں سے نظر نہیں آتا؟"

لیکن مکر جی کا دلی جوش ایسا معمولی نہ تھا کہ وہ اس جواب کی درشتی کو محسوس کرتا۔ اس نے سنبھلی ہوئی آواز سے پھر کہا "براے مہربانی مجھے دکھا دیجئے۔ اس کی قیمت کیا ہے؟"

قیمت کے سوال نے بڈھے پر جادو کا اثر کیا۔ اس کی تجربہ کار آنکھ نے بابو کی حیثیت کو بھانپا اور خیال کیا کہ زیادہ دام مانگنے فضول ہونگے۔ ایسا نہ ہو کہ چڑیا ہاتھ سے نکل جائے۔ اس لئے اس نے نہایت ملائمت سے کہا۔

"دام تو بہت ہیں لیکن آپ سے میں سات روپیہ ہی لے لونگا"۔

کانپتی ہوئی انگلیوں سے مکر جی نے وہ بت دکاندار کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کی قیمت ادا کر دی۔ جو اس کی ایک ہفتے کی کمائی سے زیادہ تھی۔ دوکاندار جسے امید نہ تھی کہ بابو اتنا روپیہ خرچ کر دیگا حیران ہو گیا۔ اور اس بات نے اس کی زبان کو کھول دیا۔

"یہ ایک قابل قدر چیز ہے بابو صاحب۔ مجھے اب یاد آیا ہے کہ جس شخص سے میں نے اسے خریدا تھا وہ کہتا تھا کہ اس میں ایک عجیب خاصیت ہے کہ جس شخص کے قبضے میں یہ ہو گا وہ شام ہونے سے پہلے پہلے تمام انسانی جذبات کو اپنے دل میں بڑی شدت سے محسوس کرے گا۔ یعنی تمول اور غربت کے راز۔ خوشی اور غم۔ محبت اور نفرت۔ موت اور زندگی

اور یہ سب کچھ سورج کے غروب ہونے سے پہلے ہی پہلے "
یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی جیب سے ایک پرانی گھڑی نکالی اور وقت دیکھ کر اور قہقہہ لگا کر کہنے لگا "اڑھائی بجنے میں دو منٹ کی دیر ہے - اس لئے اگر آپ شام سے پہلے پہلے اس تمام فہرست کو ختم کیا چاہتے ہیں تو آپ کو ذرا عجلت سے کام لینا پڑیگا" *

مکرجی آہستہ آہستہ بازار میں جا رہا تھا - وہ بت اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کے دماغ میں خون ایک نئے انداز سے حرکت کر رہا تھا - بازار کے کونے پر رُک کر وہ اور آہستہ چلنے لگا - اس کے قلب پر آئندہ ہونے والے واقعات کی امید بھری خواہش سی طاری تھی - دُور کسی گھڑیال نے آدھ گھنٹہ بجایا *

گھڑیال کی گونج ابھی بالکل ختم نہ ہوئی تھی - کہ اُسے پیچھے کی طرف سے ایک ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی - اس کا دل اُچھلا اور وہ یک لخت مڑ کر دیکھنے لگا - اُس کے پاس ہی ایک بہت بڑی زرد رنگ کی موٹر کھڑی تھی جس کی چمک دمک شوفر کی وردی اور ہلکی آواز سے تمول اور طاقت کا اظہار ہوتا تھا *

موٹر کے اندر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی منہ پر ریشمی رومال رکھے بیٹھا تھا اور صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں - لیکن مکرجی کی نظر اُس پر سے گذر کر ایک دُوسری ہستی پر جو اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی حیرت اور استعجاب سے جم کر رہ گئی - یہ ایک عورت تھی جس کا صاف سفید رنگ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں چھوٹے چھوٹے ہونٹ اور لمبے سیاہ لہراتے ہوئے بال تھے - اور اس نے ایک ہلکے دھانی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی *

مکرجی مبہوت ہو کر اودھر دیکھ رہا تھا کہ گویا اعجاز کا ظہور ہُوا ۔یعنی اُس حسن کی دیوی نے موٹر میں سے آگے کو جھک کر اُسے اشارے سے بُلایا۔ یہ بیچارہ بُت بنا ہُوا بحِس و حرکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا ۔ بلانے کا اشارہ پھر کیا گیا اور اس دفعہ ایک سفید نازک جواہرات سے لدے ہوئے ہاتھ نے موٹر کے دروازے کو کھولدیا ۔اور ایک نہایت میٹھی اور سُریلی آواز آئی ۔ آؤ"۔

کیا ابھی سے اُس چھوٹے سے سبز دیوتا نے اپنا طلسمی اثر شروع کر دیا تھا کیا اُس کی اَن دیکھی باتوں کو دیکھنے کی خواہش اتنی جلدی پُورا ہونے کے قریب تھی ؟ اس نے ارادہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو وہ اب پیچھے نہیں ہٹے گا ۔ چنانچہ بت کو جیب میں ڈال کر چپ چاپ موٹر میں سوار ہو گیا ۔

اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدمی کو جو موٹر میں بیٹھا ہُوا تھا ان تمام باتوں سے کچھ دلچسپی نہ تھی ۔ وہ اپنے کونے میں بیٹھا ہُوا سامنے کی طرف دیکھتا رہا ۔لیکن اس دیوی نے ہاتھ کے اشارے سے مکرجی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اپنی ہلکی لیکن بے حد سُریلی آواز سے بنگالی زبان میں کہنے لگی "مجھے آپ سے کچھ کام ہے ۔ اس میں غالباً آپ کا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ صَرف ہوگا ۔لیکن میرے لئے یہ ایک زندگی اور موت کا سوال ہے اور آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں ۔کیا آپ میری خاطر یہ کام انجام دیں گے ؟" اس نے اپنی سفید نرم انگلیوں کو مکرجی کے سخت اور (اُس وقت) بہت سرد ہاتھ پر رکھ دیا ۔ اور آگے کو جُھک کر پھر پوچھا "مہربانی کر کے مجھے جواب دیجئے ۔مَیں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہ کام کر کے آپ کو پچھتانا نہیں پڑیگا"۔

رُکتے رُکتے اُس نے جواب دیا" ہاں"، اور پھر صاف آواز سے" ہاں - مَیں آپ کے واسطے جو کچھ آپ چاہیں کرنے کے لئے تیار ہوں "۔

"آپ کا نام کیا ہے ؟"

"مکرجی "

"کیا اچھا نام ہے -آپ مجھے کملا کے نام سے مخاطب کر سکتے ہیں - گو اس کی ضرورت ہمیں صرف ایک گھنٹہ کے قلیل عرصہ کے لئے ہی ہوگی - آپ میرے دوست ہیں - اور مہربان ہیں -آپ میرے لئے ایک بھاری خدمت انجام دینگے ! اور اس کے عوض میں مَیں آپ کو تمام عمر یاد رکھوں گی "۔

مکرجی کی نظر گھبرائے ہوئے انداز سے اُس ادھیڑ عمر کے آدمی کی طرف اٹھی -عورت نے اُس کا مطلب فوراً سمجھ لیا ۔

"اُس کی کچھ فکر نہ کریں - وہ صرف اپنی زبان ہندوستانی جانتا ہے - بنگالی زبان نہیں سمجھتا "اُس کے منہ سے ایک لمبی آہ نکلی اور ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے سے بے حد تکلیف اور اندوہ ظاہر ہونے لگا -آہ - پرمیشر مجھے اس دکھ سے نجات دے "۔

مکرجی کا سر عجیب قسم کے احساسات سے گھوم رہا تھا - اور اُسے دین و دنیا کی کچھ خبر نہ تھی - اُس نے پوچھا" وہ کیا خدمت ہے جو میں آپ کے لئے سرانجام دے سکتا ہوں ؟" اور وہ حیران تھا کہ اس عورت نے اپنے کام کے لئے اُسے ہی کیوں انتخاب کیا ہے ؟

عورت نے اُس کی طرف شکریہ سے بھری ہُوئی نگاہوں سے کچھ عرصہ دیکھا اور پھر کہنے لگی" میرے مہربان وہ بات آپ کو میں جلدی ہی

بتا دوں گی۔ آہ لیکن آپ کو بھوک لگی ہو گی۔ مَیں بھی کس قدر بیوقوف ہُوں" +

بڑی ہمّت کر کے مکرجی نے کہنا چاہا کہ اُسے اشتہا نہ تھی۔ ایسے وقت میں اُسے اشتہا کہاں محسوس ہوتی لیکن کملا نے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور کہا "آپ میرے مہمان ہیں۔ اور پھر آپ میرے لئے ایک اہم کام انجام دینے والے ہیں کہدو نہ ہاں کملا"

مکرجی کو گویا دُور سے اپنی آواز یہ کہتے ہوئے سُنائی دی "ہاں کملا۔ دیوی۔ میں آپ کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں جو کچھ بھی آپ فرمائیں" +

موٹر بازاروں میں سے گذرتی جا رہی تھی۔ لیکن مکرجی کو کوئی احساس سوائے اس کے نہ تھا۔ کہ بھینی بھینی انگریزی عطر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اور اُس کے پہلو میں بجلی سی کوند رہی تھی +

اس کے بعد گویا ایک خواب سا تھا جس میں موٹر ٹھیر گئی۔ اور وہ اُس ادھیڑ عمر کے آدمی اور اس تصویر کے پیچھے پیچھے ایک کمرے میں داخل ہؤا۔ میز پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانے چنے گئے۔ جو اُسی طرح خواب کی حالت میں اُس نے کھائے۔ کبھی کبھی ایک گھنٹی کی طرح سُریلی ہنسنے کی آواز آجاتی تھی۔ جس سے مکرجی کے دل کے تاروں میں ایک جھنکار سی پیدا ہوتی تھی۔ وہ دوسرا آدمی چپ بیٹھا رہا اور اس نے گفتگو میں کوئی حصّہ نہ لیا۔

کھانا کھانے سے رفتہ رفتہ مکرجی کے کمزور بدن میں طاقت آنی شروع ہوئی۔ اور اُس کے چہرے پر رنگ آنے لگا۔ اس کے دل میں خیال آیا

کہ غالباً عیش اسی کا نام ہے ۔

کملا نے نہایت خوش ہو کر ہنستے ہوئے کہا " بابوجی اب تو آپ اس قدر تبدیل ہو گئے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے ۔ اس وقت آپ پوری صحت میں اور طاقتور معلوم ہوتے ہیں "۔

مکرجی نے اس کی صاف اور چمکدار آنکھوں کی طرف نگاہ اٹھائی " یہ میری زندگی کا پہلا قابل یادگار دن ہے ۔ برائے مہربانی مجھے بتائیے کہ اس کا عوض میں کس طرح ادا کر سکتا ہوں ۔ آج تک میری عمر ایک پودے یا جانور کی طرح بسر ہوئی ہے ۔ آپ نے مجھے نئی زندگی بخش کر ایک نئی دنیا کے کنارے لاکر کھڑا کر دیا ہے ۔ مجھے اب احساس کی ضرورت ہے ۔ خواہ اس میں درد ہی کیوں نہ ہو "۔

کملا نے اس آدمی کے دبلے پتلے پر شوق چہرے کی طرف دیکھا جس میں وہ آگ چمک رہی تھی جس کی ایک چنگاری بھی آج سے پہلے وہاں موجود نہ تھی " مکرجی صاحب ! آپ کو زندگی کی خواہش ہے اور احساس کی ۔ خواہ اس میں درد ہی کیوں نہ ہو "؟ اس کے چہرے پر سے ایک سایہ سا گذرا " ہاں ۔ میرے پیارے محسن زندگی ایسی ہی چیز ہے ۔ یعنی اگر انسان سطح سے نیچے اصلیت کی تھوڑی دور بھی جانے کی کوشش کرے ۔ تو تکلیف ہوتی ہے ۔ ضرور ہوتی ہے ۔ میں جانتی ہوں کیونکہ میں اس درد کی لذت سے واقف ہوں " اس کے ہاتھوں کی انگلیاں زور سے بند ہو گئیں ۔

مکرجی نے آہستہ آہستہ پوچھا " مجھے اپنی زندگی کے کچھ حالات بتائیے کملا ۔ بتائیے ۔ کہ میں آپ کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں "؟

وہ عورت اپنی جگہ سے اُٹھ کر اسی صوفے پر آ بیٹھی جس پر مکر جی بیٹھا تھا اور کہنے لگی "سُنیئے۔ میں آپ کو ایک کہانی سناتی ہوں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کئی سال ہُوئے کہ کلکتہ میں ایک لڑکی تھی جس کا نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کملا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اپنی کہانی سنا رہی ہیں"

"ہاں کملا تھا۔ اس کے والدین پرانے خاندانی رئیس تھے اور اس بات پر انہیں ناز تھا لیکن وہ غریب ہو گئے تھے۔ کچھ جائداد یعنی مکانات وغیرہ اور زمین تو تھی لیکن اُن کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان میں سے کچھ گروی تھے اور باقی کی شان قائم کرنے کے لئے روپیہ نہ تھا۔ لڑکی تعلیم یافتہ تھی۔ حسین تھی۔ لیکن یہ تعلیم اُسے صرف ایک ارادے کو مدنظر رکھکر دلائی گئی تھی کہ وہ کسی دولتمند شخص سے شادی کرے تاکہ اس کا بھائی چمن جو جائداد کا وارث تھا اس قابل ہو جائے کہ اپنی پرانی رئیسانہ شان و شوکت کو حاصل کر سکے"

مکر جی کے منہ سے نکلا "اُف کس قدر ظلم ہے۔ وہ کس طرح یہ خواہش کر سکتے تھے کہ تمہیں بیچ دیں اور تمہارے بھائی پر تمہاری زندگی کو قربان کر دیں؟"

کملا نے اپنی اُنگلی اُٹھائی "نہیں صرف بھائی کے لئے نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے خاندان کا نام ونمود قائم رہے۔ اور چمن کی اولاد کے پاس بھی اتنا روپیہ ہو سکے کہ وہ رئیس کہلائیں"

"لیکن کیوں؟ کیا تمہارے بھائی کی شادی وہ ایسی جگہ نہ کر سکتے تھے جہاں سے اُسے روپیہ ہاتھ آجاتا۔ اور تمہاری زندگی خراب نہ ہوتی؟"

"نہیں چمن نے اپنے آپ کو نالائق ثابت کیا تھا۔ اُس نے اچھی تعلیم

حاصل نہ کی تھی۔ اور بیکار تھا۔ اس لئے کوئی امیر آدمی اُسے اپنا داماد بنانا پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ کملا ہی کی شادی کسی روپے والی جگہ کی جائے۔ خواہ خاوند کی عمر کچھ ہی ہو۔"

بیچارے کلرک کا دل اُبل رہا تھا۔ لیکن اُس کے منہ سے سوائے اس کے کہ "کس قدر خود غرضی ہے"۔ اور کچھ نہ نکلا۔

عورت نے کہانی کو جاری رکھا "کملا کو اپنے والدین سے محبت تھی۔ اس کو چمن سے بھی محبت تھی۔ خواہ وہ کیسے ہی خود غرض تھے۔ اور وہ صابر و شاکر ہو کر ان کی مرضی کے مطابق شادی بھی کر لیتی اگر قسمت نے اُس کے راستے میں ایک شخص مسمی ہری لال گھوش کو نہ لا ڈالا ہوتا۔ ان دونوں یعنی کملا اور ہری لال کی ملاقات ایک گارڈن پارٹی میں ہوگئی۔ ہری لال کی محبت ایک اندھے اور دیوانہ وار جوش سے مشابہ تھی۔ اور کملا بیچاری پنجرے کی قیدی چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتی تھی۔ لیکن قفس کی تیلیوں کو توڑنے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ کلرک جی نے پوچھا "کیا اس کی مالی حیثیت کچھ اچھی تھی؟"

عورت نے سر کو ہلایا "نہیں۔ وہ دونوں وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے مل لیتے تھے۔ ہری لال کا دل امید کے خوشگوار خواب سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن وہ آنے والی جدائی کے یقین سے اُلجھی جاتی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ والدین کی مرضی کے خلاف نہیں چل سکتی۔ آخر ایک دن روپیہ کی اشد ضرورت آ پڑی۔ چمن نے بہت سا روپیہ کہیں جوئے میں ہار دیا۔ اور اس کے والدین نے فیصلہ کر لیا کہ کملا کی شادی فوراً کر دینی چاہیئے۔"

عورت ایک دو لمحے کے لئے ٹھیر گئی اور نظر اٹھا کر اُس نے اُس خاموش

ادھیڑ عمر کے آدمی کی طرف دیکھا جو کمرے کے دوسرے کونے میں اُن دونوں پر اپنی سیاہ پُرغور آنکھیں جمائے ہوئے بیٹھا تھا" ایک بڑے امیر پولیس افسر کے پاس اُن کی بہت سی زمینیں گروی تھیں۔ اُسے کملا کے ساتھ شادی کرنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اور اس نے اس شادی کے عوض بہت سا روپیہ انہیں دینے کا وعدہ بھی کیا تھا"۔

جب یہ غم کملا سے تنہا برداشت نہ ہو سکا۔ تو اس معاملہ کا ذکر اُس نے ہری لال گھوش سے کیا۔ اُس نے قسم کھائی کہ وہ اتنا روپیہ حاصل کرنے کے لئے زمین و آسمان کو ہلا دیگا۔ اور خواہ کچھ ہو جائے تین ہفتہ سے پہلے روپیہ پیدا کر لے گا۔ کیونکہ کملا کی شادی ایک ماہ بعد قرار پائی تھی۔ شادی کی تیاریاں بڑی عجلت سے کی جانے لگیں اور کملا ہر ایک گھڑی اس انتظار میں کاٹنے لگی کہ لال اُس کو تمام عمر کے لئے غم واندوہ میں دفن ہو جانے سے بچا لے گا۔ لیکن شادی میں ایک دن رہ گیا اور ابھی تک اُس کا پتہ نہ تھا"۔

"اُس نے خفیہ خفیہ گھر سے نکل کر شہر میں ہر ایسی جگہ تلاش کیا جہاں اُس کا ہونا ممکن تھا۔ کملا کے دل کی تکلیف کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے ایک شخص سے بے حد محبت تھی۔ لیکن اس کی شادی ایک دوسرے شخص کے ساتھ جس کی اور اُس کی عمر میں بہت تفاوت تھا جبراً کی جا رہی تھی"۔

مکرجی کی آنکھوں سے آنسو گرنے کے قریب تھے" افسوس! پھر کیا ہوا؟ کیا ہری لال وقت سے پہلے پہنچ گیا یا نہیں؟"

کملا نے جواب میں سر ہلا یا "نہیں۔ لیکن اس کا قصور نہ تھا۔ وہ

بیمار ہو گیا۔ اور شادی کے تین دن بعد وہاں پہنچا۔ آہ! بہتر ہوتا کہ وہ کبھی واپس نہ آتا۔ اُس صورت میں کملا کو اس قدر رنج نہ ہوتا۔"

"کیا وہ روپیہ لے آیا تھا؟"

"ہاں۔ یہی تو سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک خفیہ پولیٹیکل انجمن کے ہاتھ میں فروخت کر دیا تھا۔ اور تمام عمر اُن کا خونی کام انجام دینے کا وعدہ کر آیا تھا۔ صرف اس لئے کہ اپنی محبوبہ کو ظالموں کے ہاتھ سے بچا سکے۔ لیکن اُسے بخار ہو گیا۔ اور وہ اس وقت چارپائی پر بے ہوش پڑا تھا جب کملا کے والدین نے کملا کو زنجیروں سے جکڑ دیا گیا وقت اب ہاتھ نہ آسکتا تھا۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ وہ تمام عمر ایک خوفناک انجمن کا ساتھ دینے کا تہیہ کر چکا ہے اور انجمن بھی وہ انجمن جس کو تباہ و برباد کرنے کی اس پولیس افسر نے قسم کھا رکھی تھی جو کملا کا خاوند تھا۔"

مکرجی کے منہ سے ایک لمبی سرد "آہ" نکلی۔

عورت نے تھکے ہوئے انداز سے اپنی پیشانی سے بالوں کو پیچھے ہٹایا "کئی سال سے وہ پولیس افسر اُس انجمن کے ممبروں کو ایک ایک کر کے قابو میں لا رہا ہے۔ اور ان میں سے کئی ایک کو بڑی بڑی سخت سزائیں دلا چکا ہے۔ لیکن ہمیشہ اس کو حسنِ اتفاق کہئے یا کملا کی دعاؤں کا اثر۔ ہری لال اس کے پنجے سے نکل جاتا ہے۔ کل کملا کو اطلاع ملی کہ آج ایک شخص وہ کاغذات بہم پہنچا کر پولیس افسر کے پاس لانے والا ہے جن میں لال کے جرم کا مکمل ثبوت اور اس جگہ کا پتہ ہوگا جہاں وہ روپوش ہے۔"

"آج؟" ٹکرجی نے زور سے سانس لی۔ آخر کار اُسے معلوم ہوگیا کہ وہ خدمت کیا تھی جو اُس سے لی جانے والی تھی۔ اور اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ کوئی معمولی کام نہ ہوگا۔ ایک لمحے کے لئے تو اُس کے دل نے کمزوری یا خوف کو محسوس کیا۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ یہ وہ دن تھا جب اُس نے ایک نئی دنیا کو دیکھا تھا۔ یا یہ کہ اس میں ایک نئی رُوح پیدا ہوگئی تھی۔ وہ رُوح خوف کے اوپر غالب آگئی۔ اُس نے پوچھا "مجھے بتائیے کہ یہ شخص کون ہے؟" اُس نے اُس آدمی کی طرف جو کونے میں علیحدہ بیٹھا ہُوا تھا اشارہ تو نہ کیا لیکن عورت نے اُس کے مطلب کو سمجھ لیا۔

"یہ وہی پولیس افسر ہے جس نے کملا سے شادی کی تھی۔ یہی وہ شخص ہے جس کے ہاتھ میں ہری لال کی قسمت اور اس کی جان ہوگی۔ اور جس کو وہ تھوڑے عرصے میں شاید ابھی اس ہاتھ کی ایک حرکت سے کچل دیگا۔ اگر......."

"اگر میں اس کی مدد نہ کرسکا؟" ٹکرجی کی سانس پھولی ہوئی تھی "جلدی بتائیے کہ میں اس کے لئے کیا کرسکتا ہوں میں آپ کی خاطر ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔"

عورت نے کہا "میں حیران ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے کہاں تک آپ کو اپنے لئے خطرے میں ڈالنے کا حق حاصل ہے۔ آپ اجنبی ہیں اور یہ انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے آپ کو راستے سے بلا کر اپنے ساتھ لے لیا گو مجھے بالکل امید نہ تھی کہ آپ میری مدد کرنے کو تیار ہونگے۔ یہ آخری کوشش تھی۔ آخری پانسا

تھا جس پر میں بے اختیار ہو کر کھیل گئی "

"یہ۔ آپ کا خاوند کیا سمجھتا ہے کہ میں کون ہوں ؟"

کملا مسکرائی" نہ اُسے خبر ہے اور نہ وہ پروا ہی کرتا ہے۔ میں بہت سی ایسی باتیں کیا کرتی ہوں جن کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اور اگر چاہوں تو بالکل ناواقف آدمیوں کو اپنے گھر مدعو کر لیا کرتی ہوں۔ اُسے صرف اپنا بدلہ لینے کا خیال ہے۔ وہ اس تمام خفیہ انجمن سے بھی زیادہ ہری لال کا دشمن ہے اور اس سے قصاص لیا چاہتا ہے "

"تو کیا اِسے شبہ ہے کہ آپ کو اُس سے محبت تھی ؟"

"ہاں۔ اُسے معلوم ہے کہ مجھے اُس سے محبت تھی۔ اور مدۃ العمر رہیگی لیکن اُسے شبہ نہیں ہوا تھا۔ اُس کو بتایا گیا تھا۔ میرا راز افشا کر دیا گیا تھا "

"آپ کا راز افشا کر دیا تھا؟ کس نے ؟"

عورت کے چہرے پر درد کے آثار کا گذر اس طرح ہُوا جس طرح سُورج پر سے سیاہ بادل کا ٹکڑا گذرتا ہے " میرے بھائی نے۔ اُس شخص نے جس کے لئے میں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ ان کاغذات کو جمن ہی آج یہاں لانے والا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس آخری موقع پر اپنی تمام امیدیں آپ سے وابستہ کر دیں۔ اب بھی آپ کی مدد سے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمام ثبوت جو ہری لال کے برخلاف جمع کئے گئے ہیں ضائع کر دئے جا سکیں۔ میری موٹر باہر سڑک کے کونے پر کھڑی ہے۔ میرا ملازم آپ کو جہاں آپ کہیں گے پہنچا دیگا۔ جب میرا بھائی یہاں آئے تو آپ الگ کھڑے رہیں اور اُس سے مجھے ہی نپٹنے دیں۔ وہ مسلح ہو گا اور آپ کو اپنی جان خطرے

میں نہ ڈالنی چاہیئے مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ پیشتر اس کے کہ وہ میرے خاوند تک پہنچ سکے وہ کاغذات اس کے ہاتھ سے لے لینا اور بھاگ جانا۔ میں اس بات کا خیال رکھوں گی کہ وہ آپ کو کوئی ایذا نہ پہنچا سکے شوفر کو کہنا کہ آپ کو دریائے ہگلی کے قریب کہیں لے جائے پھر اُس کو رخصت کر کے کاغذات کو ضائع کر دینا۔ یہ یاد رہے کہ ایک آدمی کی جان اور ایک عورت کا دل آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور مجھے بچانے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا کام یہ ہوگا کہ چمن کو یا اپنے خاوند کو آپ کے تعاقب میں نہ جانے دوں۔" دروازے پر گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور عورت کے منہ سے نکلا" آہ! وہ آگیا ہے۔ پرمیشر کے لئے جو میں نے کہا ہے وہی کرنا۔ مجھے بچانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ تمام معاملہ بگڑ جائیگا۔"

میں آپ کے حکم کی تعمیل میں سرِ مو فرق نہ آنے دوں گا۔ لیکن دیوی کیا پھر بھی کبھی میں آپ کی زیارت کر سکونگا؟"

"خدا حافظ۔ مکرجی صاحب۔ میرے محسن اب غالباً کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ اور یہی بہتر بھی ہوگا۔ آج سے بعد اگر میں زندہ رہی تو اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گی۔ ممکن ہے آپ مجھے دیکھ پائیں لیکن میں آپ کو کبھی نہ دیکھوں گی"۔

دروازہ زور سے کھلا اور ایک پتلا دُبلا سانولے رنگ کا آدمی جلدی سے کمرے میں داخل ہُوا۔ عورت فوراً اُٹھ کر جھپٹی۔ مرد کے منہ سے غصے میں دو ایک الفاظ نکلے ایک فولادی دھار کی چمک دکھائی دی۔ پھر یکے بعد دیگرے پستول کی دو گولیاں چلیں کمرہ دھواں دھار ہوگیا۔ مکرجی کی ناک منہ اور آنکھوں میں دھواں بھر گیا۔ لیکن اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا

سا لفافہ تھا جو کملا نے بھائی سے چھین کر اسے دے دیا تھا - وہ لفافہ جس پر ہری لال کی زندگی کا دارومدار تھا +

وہ بازار میں تھا اور موٹر فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی - دونوں طرف کے مکانات ہوا میں اڑتے نظر آتے تھے - اور اس کا دماغ اس کمرے کے آناً فاناً ہو جانے والے واقعات کے نظارے کی یاد سے چکرا رہا تھا - وہ نظارہ اس کے دل پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو چکا تھا - یعنی کملا اور چمن کا زمین پر پڑے ہونا - اور جب لفافہ مکرجی نے اُس سے لے لیا تو کملا کے درد بھرے ہونٹوں سے "جاؤ" کی آواز - اُس ادھیڑ عمر کے آدمی کا کرسی سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ ان کی طرف چلنا گویا اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ اس قدر خوفناک حادثہ وقوع پذیر ہو چکا ہے؟

اس کمرے میں کیا ہو گیا تھا؟ کیا واقعی وہ حسن کی دیوی ہمیشہ کے لئے سرد ہو چکی تھی؟ اس کی باتوں میں وہ مقناطیسی اثر تھا - اُس کا ہر ایک عضو ایسا متناسب اور چہرے کی رنگت اس قدر صاف اور خوبصورت تھی کہ موت کا خیال بھی اس کی شخصیت سے کوسوں دُور نظر آتا تھا - وہ چہرہ اُس نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا - ضرور دیکھا تھا - لیکن کہاں؟

اُسے ایک پولیس کے سپاہی کی وردی کی جھلک دکھائی دی - اور وہ پیچھے کو موٹر کی نیم تاریکی میں ہٹ گیا - اُسے پولیس کی توجہ اپنی گذشتہ گھنٹے کی کارروائی کی طرف منعطف کرانا منظور نہ تھی - ابھی سے روزمرہ کے دنیاوی کاروبار میں سے گذرتے ہوئے اس کا دل اپنی اصلی حالت کی طرف واپس آ رہا تھا - اُس نے شوفر سے کہا کہ مجھے ہگلی کے پُل کے اس طرف اُتار دینا - اُسے اپنے منتشر خیالات کے اجتماع کی ضرورت

تھی۔

دریا کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح کملا کے لفافے کو دریا میں ڈالا جائے کہ اس کا ہاتھ جیب میں کسی ٹھنڈی سی چیز کے ساتھ لگا۔ بُت۔ وہ سبز بُت۔ گذشتہ گھنٹے کے واقعات میں وہ اُسے بالکل بھول گیا تھا۔ اس نے اُسے جیب سے نکالا اور اپنے خیال میں اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "آج تو واقعی تم نے سب کچھ کر دکھایا ہے۔ عیش۔ غربت۔ خوشی۔ غم۔ رشک۔ محبت۔ نفرت۔ اور ہاں شاید موت بھی۔ سبھی کچھ سوائے اُس آخری شئے یعنی زندگی کے۔ باوجود اس کے مجھے اس ایک دن سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔" اُس نے ایک آہ بھری "کس قدر عجیب عورت تھی۔ کملا۔ میں اسے کبھی نہ بھولوں گا۔" اور پھر اس بت کی طرف "لیکن بس۔ ہو چکا۔ اس سے زیادہ مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں۔" نہایت احتیاط سے اُس نے وہ کاغذات کا لفافہ اور سبز بت اپنے رومال میں باندھا اور دُور دریا کے بہتے ہوئے پانی میں پھینک دیا۔

سڑک پر واپس آکر وہ ٹھہر گیا۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا اُس کے پاس واپس گھر جانے کے لئے ٹرام کا کرایہ بھی ہے یا نہیں اپنی جیب ٹٹولنے لگا۔ کیونکہ اپنی تمام دولت تو وہ اس بُت کے عوض چینی دکاندار کی نذر کر چکا تھا۔ صرف تین پیسے اور ایک کھوٹی دونی نکلی۔ لیکن باہر کی جیب میں ہاتھ ڈالنے سے کاغذ کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی۔ اُس نے نکال کر دیکھا تو ایک کاغذ میں دو دس دس روپیہ کے نوٹ اور ایک سُرخ رنگ کا گلاب کا پھول لپٹا ہُوا تھا۔

تو گویا یہ کملا کا شکریہ ادا کرنے کا طریقہ تھا۔ اُسے خیال آیا کہ کملا کو کبھی یہ علم نہ ہوگا کہ اس وقت یہ روپیہ میرے لئے کیا وقعت رکھتا ہے۔ اور کس قدر مفید ثابت ہوگا۔ یہ کہکر وہ ٹرام پر سوار ہُوا اور اپنے گھر کو روانہ ہوگیا*

. . . .

. . . .

"کملا، آج تو تم نے کمال کر دیا۔ اور نہایت آسانی سے شرط کو جیت لیا۔ واقعی تم غضب کی ایکٹریس ہو۔ اب ہم اگلے ہفتے سے فلم کی تیاری شروع کر دیں گے۔ تم نے تو بیچارے کو پاگل کر دیا" یہ کہتے ہوئے وہ ادھیڑ عمر کا آدمی کملا کے قریب آیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے زمین سے اٹھا کے کھڑا کر دیا*

"اور میری کوئی تعریف ہی نہیں کرتا"، یہ کہکر وہ دُبلا پتلا سانولے رنگ کا جوان آدمی زمین سے اٹھا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا" لیکن کرشن بھائی آئندہ جب کبھی تمہیں مس موہنی سے کسی کا دو بدو مقابلہ کرانا ہو۔ تو میری نسبت کوئی زیادہ طاقتور آدمی اس کام کے لئے تجویز کیا کرو۔ یہ تو جب دل لگا کر کام کر رہی ہو تو ایک شیرنی سے بھی زیادہ خوفناک ہوتی ہے"*

نہیں اندر یہ بات نہ تھی۔ یہ تمام کارروائی مس موہنی اور میرے رمیان ایک شرط کا نتیجہ تھا۔ یہ اُس نئی فلم میں جو ہم شروع کرنے والے ہیں کملا کا پارٹ لینا چاہتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ ان میں ایسے زوردار پارٹ کو عمدہ نبھانے کی قابلیت نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے درمیان یہ شرط

ہوئی تھی کہ اگر مس موہنی "کملا" کا لباس پہن کر کہانی کے مطابق وہی کام درحقیقت کر سکیں جو انہیں فلم میں کرنا ہوگا یعنی ایک اوسط درجے کے اجنبی آدمی کو راستہ چلتے ہوئے پکڑ کر اپنے لئے جان تک دینے پر آمادہ کرلیں تو میں ان کو "کملا" کا پارٹ دے دوں گا۔ یہ شرط تو بیشک مس موہنی نے جیت لی ہے لیکن اس تماشے میں اپنے ناخواستہ خاوند کا پارٹ جو مجھے دیا تھا وہ بہت سخت تھا" یہ کہکر فلم کمپنی کا ڈائرکٹر کرشن قہقہہ لگا کر ہنسا اور کہنے لگا "بیچارہ مکرجی۔ آج رات اُسے نیند نہیں آئے گی"

مس موہنی نے ساڑھی کی پن کو بڑی نفاست سے اُتارتے ہوئے کہا "ہاں بیچارہ مکرجی خوب آدمی تھا"۔

(ہمایوں)

ایک مصلح بُت تراش

(از مولینا نیاز فتحپوری ۔ مدیر رسالہ نگار بھوپال)

شہاب، فطرتاً نقّاش تھا اور ایسا نقّاش کہ ہر منظر اس کے قلم سے چھو جانے کے بعد ذی حیات نظر آنے لگتا تھا، اور اس کے ہاتھ کا ہر نقش یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا فطرت کسی تخئیل میں مصروف ہے۔

صبح و شام کی کیفیات، باغ و صحرا کی دلفریبیاں، کوہ و دریا کے مشاہد، جس خوبصورتی کے ساتھ اس کے قلم کی جنبش میں منتقل ہو جاتے تھے، اس سے ہر شخص واقف تھا، لیکن یہ صرف اس کے خاص احباب ہی کو معلوم تھا کہ جب اس کا موضوع نقاشی "نسائیت" ہوتا تھا، تو وہ اک نقاش کے حدود سے متجاوز ہو کر، ایک پجاری کی حیثیت بھی اختیار کر لیتا تھا، اور اس لئے ہر عورت کی تصویر، اس کے قلم سے پرستیدۂ جذبات، معبودۂ حیات ہو کر نکلتی تھی،

اس کے پاس جنس نازک کی تصویروں کا ایک عجیب و غریب مرقع تھا، جسے خود اُس نے اپنی زندگی کی تنہائیوں میں طیار کیا تھا، لیکن وہ انہیں کسی کو نہ دکھاتا تھا۔ کیونکہ اس کے نزدیک وہ سب ناقص و نامکمل تھیں

اور وہ کہا کرتا تھا کہ جب تک عورت کے خیال سے میرے کلیجہ کا منہ تک آجانا کم نہ ہوگا۔ میں فن کے لحاظ سے کبھی اس کی صورت گری میں کامیاب نہیں ہو سکتا وہ سب سے پوچھتا کہ یہ کب ممکن ہوگا۔ درآنحالیکہ اس کی جوانی روز بروز سنگین ہوتی جاتی اور اس کے ساتھ ہی اس کے سینہ کی وسعت جذبات کے لئے گھٹتی جاتی تھی، جسے وہ کلیجہ کے منہ تک آجانے سے تعبیر کرتا تھا،

ان تصویروں میں سب سے بہتر تصویر، اس کے نزدیک وہ تھی، جس میں ایک نوجوان لڑکی آئینہ کے سامنے اپنے بال سنوار رہی تھی، اور وہ کسی کی آہٹ پاکر دفعتہً دروازہ کی طرف گردن موڑکر متحیرانہ و پر اضطراب انداز سے دیکھتی ہوئی ظاہر کی گئی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مجھ سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں تصویر میں بھی کسی عورت کے پورے چہرے کو بے حجاب دیکھ سکوں، کیونکہ صفحۂ کاغذ پر جس قدر زیادہ اس کے خد و خال نمایاں ہوتے جاتے ہیں، اسی قدر صحیح معنوں میں نقاشی کی اہلیت مجھ سے سلب ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ ایک رُخ کی تصویر بنانے کا عادی تھا۔ اس منظر میں البتہ وہ نصف سے زائد چہرہ صرف اتنا زائد کہ دوسری آنکھ کی پلکیں نظر آتی تھیں۔ بنانے پر قادر ہو گیا تھا جس کو وہ اپنی بہترین کامیابی سمجھتا تھا۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ ذوق بڑھتا گیا، اور رات دن وہ اسی فکر میں مستغرق رہنے لگا کہ کیونکر عورت کی جذباتی زندگی یا اس کی حیاتِ معاشقہ کو وہ نقوش میں ظاہر کر سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اول اول تو اس کے عنفوانِ شباب کی حیاؤں نے اس میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ کیونکہ وہ عورت کے متعلق اپنے جذبات کا خیال کر کے کانپ اٹھتا تھا۔ اور اے انتہا

کوشش کے بعد بھی اس کی کاوش اس سے زیادہ مشکور نہ ہوئی کہ وہ اور اس کا قلم ایک مستقل لرزش ہو کر رہ جائے ۔ اور جب کو جب اس میں کچھ بیباکی پیدا ہوئی تو وہ حد سے زیادہ حریص ہو گیا اور عریاں ترین نقوش بھی اس کے حیات کو تسلی دینے کے لئے بالکل ناکافی ثابت ہوئے ۔ الغرض اس کی نقاشی اس فن کے دونوں کناروں ہی سے متعلق رہی ۔ اور درمیانی منزل پر، جس سے کامیابی کا یقینی تعلق تھا، اس کے شباب نے اُسے قیام نہ کرنے دیا ۔

(۲)

اک زمانہ گذر گیا، اور شہاب بدستور اپنے شغل میں مصروف رہا ۔ میری اس کی جدائی ہو چکی تھی، کیونکہ میں اپنے اسباب حیات فراہم کرنے میں آوارہ و سرگشتہ ہو رہا تھا ۔ مجھے ایک عرصہ تک اس کے حالات سے بیخبری رہی ۔

ایک شام میں ساحل تلابہ پر بیٹھا ہوا ان فطری مناظر کے تماشہ میں جنہیں صرف بمبئی کے ساحل ہی پیش کر سکتے ہیں، مصروف تھا کہ دو نوجوان لڑکیاں میرے پاس ہی بنچ پر آکر بیٹھ گئیں ۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا گفتگو کر رہی تھیں، اور غالباً آخر وقت تک اس سے بے خبر رہتا اگر ان کا یہ فقرہ کہ "شہاب اس وقت یقیناً ہندوستان کا بہترین بت ساز ہے ۔ اور نمائش میں سب سے زیادہ قیمتی انعام اُسی کو ملنا چاہیئے تھا" مجھے نہ چونکا دیتا ۔

شہاب بت ساز! نمائش، انعام!!! میں متحیر تھا اور سخت بے قرار، کہ کیونکر ان سے گفتگو کر کے سارا حال معلوم کر دوں، پھر خیال آیا کہ ممکن ہے یہ کوئی اور شہاب ہو، لیکن جب ان میں سے ایک نے انعام حاصل کرنے والے بت ساز کی خصوصیات کو ظاہر کرنا شروع کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ سوائے

اس شہاب کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

میں بے اختیار ہو کر اس زینچ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ تہذیب مانع آئی۔ اور اس خیال کے ساتھ کہ آج اخبار میں بھی ضرور اس کا ذکر ہو گا۔ وہاں سے چلا رہا۔

(۴)

اس واقع کے ایک ہفتہ بعد میں شہاب کی جائے قیام پر اُس سے ملا۔ وہ میرے ساتھ نہایت تپاک سے پیش آیا۔ چند رسمی کلمات کے بعد جب میں نے اس کی مجسمہ سازی کی تعریف کی تو اُس کے رخسار وفور مسرت سے تمتا اُٹھے اور وہ نگاہیں جھکا کر کہنے لگا ہاں اب میں بت تراش ہوں، "مجسمے تیار کرتا ہوں، پتھر کی مورتیں بناتا ہوں، نقاشی سے زیادہ بیکار کوئی چیز نہیں، میری نگاہیں اس کو دیکھتے دیکھتے تھک گئیں، میرا ہاتھ صورت تو بنا سکتا تھا، لیکن اُسے چھو نہ سکتا تھا۔ مگر اب میں نے اپنی خواہش کے مطابق عورت اور اس کے شباب کو قابل لمس بنا لیا ہے۔ میں ایک ایسا خالق ہوں جو اپنی مخلوق کو اپنی آغوش میں بھی لے سکتا ہے۔ میرا خیال جو پہلے صرف سطح پر مرتعش نظر آتا تھا، اب اُبھر کر مجسم ہو گیا ہے۔ اس نے صورت اختیار کر لی ہے اور ہر چند اب میں پہلے سے کہیں زیادہ بیتاب و مضطرب ہوں، لیکن اس اضطراب میں واقعیت ہے اس بیتابی میں حقیقت ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ جس صورت نے میرے دل کو معمور کر رکھا ہے، وہ میری حیات جسمانی میں بھی میرے پیش نظر ہے۔ میرے کمرہ کا ایک ایک کونہ اس سے آباد ہے۔ میں اس کو چھو سکتا ہوں، اس کے آگے دو زانو ہو سکتا ہوں۔ اور جب چاہوں اس کے آگے سر بسجود

ہو کر اپنی پرستارانہ اشکباری سے، اس کے خوبصورت جسم، اس کے حسین شباب کو پُرنم کر سکتا ہوں۔"

مَیں سُن رہا تھا اور حیرت کر رہا تھا، کہ وہ شہاب، جو اب سے پانچ سال قبل بے انتہا خاموش زندگی بسر کرنے کا عادی تھا، کیونکر ایسا عملی آدمی بن گیا۔ وہ اگر پہلے نقاشی کی طرف مائل تھا تو صرف اپنے ادبی ذوق کی بنا پر لیکن اب وہ اپنی بت سازی کے لئے دلائل بھی پیش کر سکتا تھا، یعنی اگر وہ پہلے صرف اک شاعر نقاش تھا تو اب اس کی حیثیت ایک فلسفی بت تراش کی تھی، میرا جی چاہتا تھا کہ وہ شروع سے اپنے حالات زندگی مجھ سے بیان کرے، لیکن میں دیکھتا تھا کہ وہ "حال" میں اس قدر مستغرق ہے کہ اس سے "ماضی" کی نسبت کوئی سوال کرنا گویا بھولا ہوا کوئی خواب یاد کراتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ تمہاری بت گری کی ابتدا کیونکر ہوئی، یہ سُن کر اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور بولا یہ سوال فضول ہے، لیکن اک عجیب و غریب واقعہ تمہیں سُناتا ہوں:۔

"میری بت تراشی کی ابتدا تھی اور ابھی تک میرا کوئی خیال میری خواہش کے مطابق پتھر میں منتقل نہ ہو سکا تھا۔

ایک دن ہفتوں کے غور و تامل کے بعد میں نے ایک مجسمہ کی تشکیل شروع کی، مَیں سمجھتا تھا کہ اگر اس میں کامیاب ہو گیا، اگر میں اپنی تمناؤں کو اس طرح منجمد و متشکل دیکھ سکا، تو اس وقت تک کی محنت کی داد حاصل کر سکوں گا، تمہیں شاید یہ نہ معلوم ہو گا کہ ایک بت کی تعمیر ہمیشہ سر کی جانب سے شروع ہوتی ہے، لیکن میں نے عام دستور کے خلاف پاؤں

کی طرف سے ابتدا کی اور کامل ایک ماہ کی محنت اور سینکڑوں نمونے بنانے بگاڑنے کے بعد وہ ننھے ننھے نازک پاؤں جس میں ایک پورا اور دوسرے کا صرف پنجہ زمین پر قائم تھا۔ بنا سکا اس کے بعد میں سخت الجھن میں پڑ گیا۔ کیونکہ پنڈلیوں کو عریاں بنانا صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ سارے مجسمے کو عریاں بناتا اور اس کی ہمت میں اپنے ضعیف قلب میں نہ پاتا تھا آخر کار میں نے حد درجہ اضطراب کے عالم میں ایک فیصلہ کر لیا اور چھ ماہ تک روز و شب اسی شغل میں مصروف رہنے کے بعد ایک عورت، وہ عورت جو اس سے قبل صرف میرے خیال پر حکمران تھی، پیدا کر لی، اور وہ عالمِ اجسام میں رُونما ہو گئی۔ وہ اس درجہ حسین تھی کہ مشکل سے کسی کا تصور اس کے حسن تک پہونچ سکتا تھا، وہ ایسی جوان تھی کہ شائد ہی ایسی جوانی کسی انسان میں پائی جا سکتی ہو، اگر میں یہ کہوں کہ اس کا شباب نہایت سنگین تھا تو کوئی عجیب بات نہ ہو گی کیونکہ وہ واقعی پتھر کی تھی، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ میں جب اُس کے جسم کو کبھی مضطرب و بیتاب ہو کر چھو لیتا تھا تو اک نرمی بھی محسوس کرتا تھا اور جب اس کے چہرہ پر نگاہ پڑ جاتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ گفتگو کر کے ابھی خاموش ہوئی ہے ٭

میں گھنٹوں بیٹھا ہوا اُسے دیکھا کرتا تھا، رات رات بھر اس کے چہرہ کو اس کے جسم کو، جسم کے ایک ایک عضو کو اعضا کے تناسب کو بجلی کی روشنی میں دیکھا کرتا تھا! اور صبح کے وقت جب زیادہ مغلوب خواب ہوتا تھا تو اس کے قدموں پر سر رکھ کر سو جاتا تھا، رفتہ رفتہ سارے مشاغل چھوٹ گئے، میرے تمام اوقات خراب ہو گئے حتیٰ کہ خواب و خور ترک ہو گیا۔ اور آخر کار میں نے محسوس کر لیا کہ مجھے اس کے ساتھ

محبت ہے۔

میں گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھ کر روتا، سربسجود ہو کر اپنی تمنائیں پیش کرتا، اس کے سکوت وجمود کو برہمی سے تعبیر کرتا اور الحاح وزاری میں مصروف اور کبھی ایسا محسوس کرتا کہ شائد وہ مسکرا رہی ہے۔ لیکن جب میں بیتاب ہو کر اس کے قریب پہنچتا تو پھر وہ اسی طرح سنجیدہ وغیر متحرک نظر آتی اور میں فرش پر گر کر بے ہوش ہو جاتا۔

ایک رات جبکہ میری دیوانگی بہت بڑھ گئی تھی اور میرے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تھا، کہ اس کے قدموں پر گر کر اپنے کو ہلاک کردوں، اس مجسمہ میں حرکت پیدا ہوئی، اس کے اعضا میں جنبش محسوس ہونے لگی۔ اور دفعتہً میری آغوش میں آکر مجھے بے ہوش کر گئی۔

یقیناً اک مجسمہ کا زندہ ہو جانا، بجائے خود ایک ایسی بات تھی کہ مجھے فرطِ حیرت سے دیوانہ ہو جانا چاہئے تھا، لیکن میرے دل ودماغ میں اس کی محبت، اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی مسرت نے کسی اور خیال کے لئے کوئی جگہ ہی باقی نہ رکھی تھی، اور بغیر اس حقیقت پر غور کئے ہوئے کہ ایسا کیونکر ممکن ہے، قدرت میری کس ادائے طلب سے مالوف ہو کر رحم کرنے پر مجبور ہو گئی، میں اس میں جذب ہو گیا اور اس زندگی میں اول بار میں نے محسوس کیا کہ عورت کا مفہوم کیا ہے اور اس کی ترکیب کن آلہانہ لذات سے ہوئی ہے۔ جو دن گذرتا تھا، میں اس کی ملکوتی نرمی اور سماوی شفقت کو زیادہ قوت کے ساتھ محسوس کرتا جاتا تھا، یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد میری ہستی اُس کے لطف و رافت سے اس قدر معمور ہو گئی کہ میری رُوح نے بغاوت شروع کر دی اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ شاید میں اس سے

بیزار ہوگیا ہوں، وہ میری خدمت کرتی تھی اور میں اس میں کوئی عجیب بات نہ دیکھتا تھا؛ وہ مجھ پر مٹی جاتی تھی، لیکن میں یہ سمجھ کر کہ اس طرح وہ اپنا فرض ادا کر رہی ہے، بجائے اس کی طرف کھنچنے کے اپنے اندر اک بیزار محسوس کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ شاید فطرت نے عورت کو اسی لئے وضع کیا ہے کہ وہ مرد کی خدمت کرے اور کوئی احسان نہ رکھے اور مرد کی تخلیق کا منشا یہی ہے، کہ وہ عورت سے کام لے اور منت پذیری کے جذبات اس میں نہ پیدا ہوں +

اب میری برہمی اس کی طرف سے بڑھتی جاتی تھی، میں ذرا سی بات میں مشتعل ہو جاتا تھا، اگر کوئی ادنےٰ سی بات بھی میرے خلاف مزاج ہو جاتی تھی تو غصہ سے بھر جاتا تھا، وہ میری جھڑکیاں سنتی تھی اور سہتی تھی، وہ میری سختیاں دیکھتی تھی اور پھر اسی طرح مسرت و انہماک کے ساتھ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مصروف ہو جاتی تھی۔ میرے اندر بجائے اس کے کہ اس طرز عمل سے نرمی و رافت پیدا ہوتی، زیادہ سختی بڑھتی جاتی تھی اور اب میں اس سے بالکل متنفر ہو گیا تھا۔

برسات کی ایک رات جبکہ میں باہر سے بھیگتا ہوا اور پریشان داخل ہوا، تو میں نے اسے اپنے کمرہ میں نہ پایا، جہاں بیٹھ کر وہ انتظار کیا کرتی تھی، یہ دیکھتے ہی مجھے سخت طیش آگیا اور گھر میں اس کی جستجو کرنے لگا، میں نے دیکھا کہ وہ ایک کونے میں کرسی پر سر ڈالے ہوئے کانپ رہی ہے (وہ حقیقتاً میرے اس وقت تک گھر نہ آنے کی وجہ سے رو رہی تھی)، اس منظر نے مجھے غیر معمولی طور سے غضبناک بنا دیا، اور نہایت ہی خشن لہجہ سے میں نے اس کو آواز دیکر چونکا دیا۔ وہ میری آواز سنتے ہی آنسو پونچھتی

ورا

ہوئی اُٹھ بیٹھی، لیکن میری برہمی کو دیکھ کر سہم گئی اور آہستہ آہستہ مجھ سے ہٹتے ہٹتے اسی کونہ میں جاکر کھڑی ہوگئی جہاں میں نے اس کا بت طیار کیا تھا۔ اس کے طرز عمل نے مجھے حد درجہ غضب آلود کردیا اور بے اختیار ہوکر میں نے ایک لکڑی جو میرے ہاتھ میں تھی اس کے نرم و نازک جسم پر ماری، لیکن اس ضرب سے ایسی آواز پیدا ہوئی، جیسے دو سخت چیزوں کا تصادم ہوگیا ہو، اس سے میں اور زیادہ برہم ہوا اور دوسری لکڑی اس سے زیادہ قوت کے ساتھ ماری، میری لکڑی کے دو ٹکڑے ہوگئے اور میں نے چاہا کہ ہاتھ سے پکڑ کر اُسے گھسیٹ لوں۔ لیکن جب اس کے قریب پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مجسم تھی ساکن و بے حس، وہ ایک مورت تھی بارد سنگیں، وہ ایک پیکر حسین تھی، لیکن گہرے خواب میں مصروف۔

یہ افسانہ نوم طویل کا ہو یا خواب کا۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ اس کے بعد حقیقی معنی میں میری آنکھ کھلی اور میں نے محسوس کیا کہ اس وقت تک میں نے جس چیز کو عورت سمجھا تھا وہ عورت نہ تھی، کیونکہ عورت نام اس کے حسن جسمانی اور تناسب اعضا کا نہیں ہے بلکہ اُس کے حسن صفات کا ہے جس سے بہتر درس اخلاق دینے والی چیز دنیا میں اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

یقیناً میں اس واقعہ کے بعد بھی اپنے مشاغل میں بدستور مصروف رہا، لیکن اس سے قبل میں جو مجسمے طیار کیا کرتا تھا ان میں میرے جذبات حیوانی بھی شامل ہوتے تھے اور اس لئے وہ صنعت کے نقطہ خیال سے (جو حد درجہ معصوم چیز ہے) ناقابل التفات ہوتے تھے اور اب اُن سے وہ جذبات ظاہر ہوتے ہیں جو صحیح معنی میں فطرت نسوانی سے متعلق ہیں، اور اسی دور کا ایک مجسمہ تھا جس نے میری دنیاوی شہرت کو بھی مکمل کرکے دکھا دیا۔

کیا اب بھی تم مجھے ملامت کرو گے، بمبئی کی شاید ہی کوئی حسین لڑکی ایسی ہوگی، جس نے مجھ سے یہ خواہش نہ کی ہو کہ میں اسے پتھر میں تبدیل کردوں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان کے مجسمہ اس دَور سے متعلق ہونگے جسے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں میں ان کی یہ خواہشیں رد کر دیتا ہوں، کیونکہ یہاں کے مغربی تمدن نے عورتوں کی نسائیت کو سلب کر لیا ہے! ور اب وہ صرف خواہش نفسانی کی دیویاں ہیں جن کو دیکھکر میری روح لرز جاتی ہے +

(۴)

میں نے اُس مجسمہ کو جاکر دیکھا، جس نے شہاب کو غیر فانی بنا دیا ہے +

ایک عورت جو ہزار دشواریوں سے کچھ سامانِ غذا فراہم کرسکی ہے بوسیدہ لباس میں اپنے اندھے شوہر کے سامنے کھڑی ہوئی اپنی دن بھر کی محنت کا ثمرہ پیش کر رہی ہے اور اپنے دونوں چھوٹے بچوں کو جو بھوک سے بیتاب ہوکر اس سے لپٹے جاتے ہیں ہاتھ سے علیحدہ کر رہی ہے تاکہ وہ سب سے پہلے اس ہستی کی تکلیف کو دُور کرسکے جس کے لئے ہندوستان کی عورت جان دیدینا بھی ادنیٰ خدمت خیال کرتی ہے +

(نگار)

بازیافت

جب میں سسرال آئی۔ تو بالکل غیر مہذب تھی۔ مجھے نہ پہننے اور اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ نہ بات چیت کرنے کی تمیز۔ میں آنکھیں سامنے کر کے کسی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ وہ خود بخود جھک جاتیں۔ مجھے کسی کے سامنے گاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ مجھے عورتوں کے روبرو بے نقاب آنے میں بھی عار تھا۔ میں کچھ تھوڑی سی ہندی پڑھی ہوئی تھی۔ لیکن مجھے ناولوں کے پڑھنے میں لطف نہ آتا تھا۔ مجھے فرصت ملتی تو رامائن پڑھتی۔ اس میں میرا جی بہت لگتا تھا۔ میں اُسے کوئی انسانی تصنیف نہ سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اسے کسی دیوتا نے بنایا ہوگا۔ انسانی تخیل کی بلند پروازی کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ میں سارے دن گھر کا کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی۔ اپنی بوڑھی ساس سے تھر تھر کانپتی تھی۔ ایک دن دال میں نمک زیادہ ہوگیا۔ سسر جی نے کھاتے وقت صرف اتنا کہا۔ "نمک ذرا اندازہ سے ڈالا کرو۔" اتنا سُن کر کلیجہ دہل گیا۔ مجھے کوئی اس سے زیادہ سخت سزا نہیں دے سکتا تھا۔

لیکن میری یہ دہقانیت۔ میری بے تمیزی اور پھوہڑپن میرے بابو

جی (شوہر) کو پسند نہ آتی تھی۔ وہ وکیل تھے۔ انہوں نے اونچی سے اونچی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ اور گو وہ مجھ سے محبت ضرور کرتے تھے لیکن اس میں سرگرمی کی بجائے رحم کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ عورتوں کی تعلیم اور معاشرت کے متعلق ان کے خیالات بہت اعلیٰ تھے۔ وہ مجھے اس معیار سے بدرجہا نیچے دیکھ کر غالباً دل ہی دل میں افسوس کرتے تھے لیکن اس میں میری کوئی خطا نہ دیکھ کر وہ رسم و رواج پر بہت جھنجھلاتے تھے۔ انہیں میرے ساتھ بیٹھنے یا باتیں کرنے میں مطلق لطف صحبت حاصل نہ ہوتا تھا وہ سونے بھی آتے۔ تو کوئی نہ کوئی انگریزی کتاب لے آتے۔ اور اُسے گھنٹوں پڑھا کرتے۔ اگر پوچھتی کیا پڑھتے ہو تو نگاہ رحم سے دیکھ کر کہتے "تم کو کیا بتلاؤں۔ یہ آسکر وائلڈ کی بہترین تصنیف ہے" میں اپنی خامی پر دل میں حد درجہ نادم تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں ایسے بیدار مغز روشن خیال آدمی کے قابل نہیں ہوں مجھے تو کسی دہقان کے گھر پڑنا تھا۔ بابو جی مجھے ذلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ میرے لئے یہی ہزار غنیمت تھی +

ایک دن شام کے وقت میں رامائن پڑھ رہی تھی۔ بھرت رام چندر کی تلاش میں نکلے تھے۔ ان کی درد اور حسرت میں بھری ہوئی باتیں میرے دل میں چٹکیاں لے رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دل پاکیزہ جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ کہ بابو جی کمرے میں آئے۔ میں نے فوراً کتاب بند کر دی۔ ان کے سامنے میں اپنی دہقانیت کو حتی الامکان چھپاتی۔ لیکن انہوں نے کتاب دیکھ لی۔ پوچھا "رامائن ہے نا؟" میں نے خطادار نگاہوں سے دیکھ کر کہا "ہاں، ذرا دیکھ رہی

تھی "۔

بابو جی "کتاب بے شک بہت اچھی ہے۔ اور جذبات کے پہلو خوب دکھائے گئے ہیں۔ لیکن انسانی فطرت پر وہ غائر نگاہ نہیں ڈالی گئی۔ جو انگریزی یا فرانسیسی مصنفوں کی خصوصیت ہے۔ تمہاری سمجھ میں تو نہ آئے گا لیکن یورپ میں آج کل رئیل ازم (Realism) کا دورہ ہے۔ وہ انسانی جذبات کی ابتدا و نشوونما ایسی تحقیق سے بیان کرتے ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ اس امر میں اخلاق یا مذہب کی قیود کے پابند نہیں ہوتے لیکن ہمارے یہاں شاعر کو قدم قدم پر اخلاق اور مذہب پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے اس لئے اکثر اس کے جذبات غیر فطری ہو جاتے ہیں۔ یہی نقص تلسی داس میں بھی ہے "۔

میری سمجھ میں اس وقت کچھ بھی نہ آیا۔ بولی "میرے لئے تو یہی بہت ہے۔ انگریزی کتابیں کیسے سمجھوں"؟

بابو جی۔ "کچھ مشکل نہیں ہے۔ تم ایک گھنٹہ روز بھی صرف کرو۔ تو کافی استعداد ہو سکتی ہے لیکن تم نے تو گویا میری باتیں نہ ماننے کی قسم کھا لی ہے۔ تم کو کتنا سمجھایا۔ کہ مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ تم نے کان نہ دیا۔ کتنا کہتا ہوں۔ کہ ذرا صاف ستھری رہا کرو۔ پرماتما حسن دیتا ہے۔ تو وہ چاہتا ہے۔ کہ اس کی ساخت و پرداخت بھی ہوتی رہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ تمہاری نگاہ میں اس کی قدر نہیں ہے یا شاید تم یہ سمجھتی ہو۔ کہ میرے جیسے کم رو آدمی کے لئے تم جیسے بھی رہو ضرورت سے زیادہ اچھی ہو۔ یہ گویا مجھ پر ظلم ہے۔ تم مجھے جبراً دیراگ سکھانا چاہتی ہو۔ جب میں شب و روز محنت کر کے روپے

پیدا کرتا ہوں۔ تو فطرتاً میری خواہش ہوتی ہے۔ کہ اس کا بہترین مصرف ہو۔ اور اس سے بہترین حظ اٹھایا جائے۔ لیکن تمہارا دقیانوسی پن میری محنت پر پانی پھیر دیتا ہے۔ عورت محض کھانا پکانے۔ بچے جننے شوہر کی خدمت کرنے اور ایکادشی کے برت رکھنے کے لئے نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد اس سے بہت اعلےٰ ہے۔ وہ انسان کی تمام مجلسی۔ ذہنی ترقیوں میں برابر کا حصّہ لینے کی مستحق ہے۔ وہ انسانی آزادی کی مساوی حق دار ہے۔ مجھے تمہاری یہ قیدیوں کی سی حالت دیکھ کر نہایت ملال ہوتا ہے۔ بیوی انسان کا نصف بہتر مانی گئی ہے۔ لیکن تم میری ذہنی۔ مجلسی۔ جذباتی غرض ایک ضرورت بھی نہیں پوری کر سکتیں۔ میرا اور تمہارا مذہب جُدا۔ طور وطریق جُدا۔ مشاغل جُدا۔ خیالات جُدا۔ زندگی کے کسی شعبے میں مجھے تم سے ہمدردی اور مدد نہیں مل سکتی۔ تم خود سوچ سکتی ہو۔ کہ ان حالات میں میری زندگی کتنی بے لطفی سے کٹ رہی ہے"۔

بابو جی کا کہنا حرف بحرف صحیح تھا۔ میں ان کے گلے میں ایک زنجیر کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اُس دن سے میں نے اُن کے اشاروں پر چلنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اپنے دیوتا کو کیونکر ناراض کرتی؟

(۲)

یہ کیسے کہوں۔ کہ مجھے بناؤ سنگار سے نفرت تھی۔ نہیں۔ اس کا مجھے بھی اتنا ہی شوق تھا۔ جتنا ہر ایک عورت کو ہوتا ہے۔ جب مرد اور بچے بھی نمایش پر جان دیتے ہیں۔ تو میں تو عورت ہی ہوں۔ اب تک جو میں اس سے محترز رہتی تھی۔ وہ اپنے اوپر بہت جبر کر کے۔ میری اماں اور دادی نے ہمیشہ مجھ سے یہی کہا۔ کہ بناؤ سنگار کی عادت اچھی نہیں۔

وہ مجھے کبھی آئینے کے سامنے کھڑے دیکھ پاتیں۔ تو لعن طعن کرنے لگتیں لیکن اب باؤجی کے اصرار نے میری وہ جھجھک دُور کر دی۔ امّاں جان اور نندیں میرے بناؤ چناؤ پر ناک بھوں سکوڑتیں لیکن مجھے ان کی پروا نہ تھی۔ باؤجی کی ان مخمور نشۂ محبت سے لبریز نگاہوں کے لئے میں جھڑکیاں بھی برداشت کر سکتی تھی وہ اب مجھ سے زیادہ التفات کرتے تھے۔ اور زیادہ خوش نظر آتے تھے۔ وہ میرے لئے خوش وضع ساڑیاں۔ خوش نما جاکٹیں۔ سجیلے گاؤن چمکتے ہوئے جوتے۔ کامدار سلیپر بھی لایا کرتے لیکن میں ان چیزوں کو پہن کر کسی کے سامنے نہ نکلتی۔ یہ لباس صرف باؤجی کے لئے مخصوص تھے۔ وہ مجھے یوں بنی ٹھنی دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ مجھے دیکھ کر اب ان کو زیادہ خوشی حاصل ہوتی تھی۔ بیوی اپنے شوہر کو خوش رکھنے کے لئے کیا نہیں کر سکتی؟ گھر کے دھندے میں اب مجھے مطلق دل چسپی نہ تھی۔ میرا وقت یا تو اپنے بناؤ سنگار میں صرف ہوتا تھا۔ یا پڑھنے لکھنے میں۔ کتابوں سے مجھے ایک عشق سا ہونے لگا تھا۔

اگرچہ ابھی تک میں اپنی ساس سسر کا ادب کرتی تھی۔ ان کے سامنے گاؤن اور بوٹ پہن کر نکلنے کا مجھے کبھی حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب مجھے ان کے تحکمانہ انداز اور برتاؤ ناگوار معلوم ہوتا۔ میں سوچتی۔ جب میرا شوہر سیکڑوں روپے ماہوار کماتا ہے۔ تو میں گھر میں لونڈی بن کر کیوں رہوں؟ یوں میں اپنی مرضی سے جو کچھ چاہے کروں۔ لیکن وہ مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہیں؟ مجھے اپنی شخصیت کا احساس ہونے لگا۔ امّاں کوئی کام کرنے کو کہتیں۔ تو میں اُسے ادبدا کے ٹال جاتی۔ ایک روز انہوں نے کہا "صبح کے ناشتے کے لئے تھوڑی سی دال موٹ بنالو"۔ میں سُن کر اَن سُنی کر گئی۔ امّاں نے تھوڑی

دیر تک میری راہ دیکھی لیکن جب میں اپنے کمرے سے نکلی۔ تو انہیں غصّہ آگیا۔ وہ بہت زود رنج تھیں ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتی تھیں۔ اپنے رتبے اور خودداری کا انہیں اتنا غرور تھا۔ کہ مجھے بالکل لونڈی سمجھتی تھیں۔ حالانکہ اپنی لڑکیوں کے ساتھ وہ ہمیشہ نرمی سے پیش آتیں۔ بلکہ میں تو کہونگی انہیں سر چڑھا رکھا تھا۔ وہ غصّے میں بھری ہوئی میرے دروازے پر آئیں۔ اور بولیں "تم سے میں نے دال موٹ بنانے کے لئے کہا تھا۔ بنایا؟" میں نے کسی قدر نرش ہوکر کہا "ابھی فرصت نہیں ملی"۔

"اماں۔ تو تمہارے نزدیک دن بھر پڑے رہنا ہی کام ہے۔ یہ آج کل تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کس گھمنڈ میں ہو؟ کیا یہ سوچتی ہو۔ کہ میرا شوہر کماتا ہے۔ تو میں کام کیوں کروں؟ تو اس گھمنڈ میں نہ آنا۔ تمہارا شوہر لاکھ کمائے لیکن گھر میں میرا ہی راج رہے گا۔ آج وہ چار پیسے کمانے لگا ہے۔ تو تمہیں مالکن بننے کا دعویٰ ہو رہا ہے۔ لیکن اُسے پالنے پوسنے تم نہیں آئی تھیں۔ میں نے ہی اُسے پڑھا لکھا کے اس لائق بنایا ہے۔ واہ! کل کی چھوکری اور ابھی سے یہ مزاج"؟

میں رونے لگی۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ بابوجی اُس وقت اوپر کے کمرے میں بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ یہ سب باتیں انہوں نے بھی سُنیں۔ انہیں نہایت صدمہ ہوا۔ رات کو جب وہ گھر میں آئے۔ تو بولے "دیکھا تم نے آج اماں کا غصّہ؟ یہی سختیاں اور زیادتیاں ہیں۔ جن سے عورتوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ایسی باتوں سے کتنی روحانی کلفت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ اور انسان کا ذہنی نشوونما اسی طرح رُک جاتا ہے

جیسے ہوا اور دھوپ کے نہ ملنے سے پودے افسردہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہماری معاشرت کا نہایت تاریک پہلو ہے۔ اور اس نے ہماری قومی نکبت میں خاص حصّہ لیا ہے۔ اب میں تو ان کا لڑکا ٹھیرا۔ ان کے سامنے زبان نہیں کھول سکتا۔ ان کے حقوق مجھ پر اس قدر زیادہ ہیں۔ کہ ان کی شان میں ایک سخت کلمہ بھی میری زبان سے نہیں نکل سکتا۔ اور یہی قیود تمہارے اوپر بھی عاید ہیں۔ اگر تم نے ان کی باتیں خموشی سے نہ سُن لی ہوتیں تو مجھے بیحد ملال ہوتا۔ میں شاید زہر کھا لیتا۔ ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو ہمیشہ ان کی گھُڑکیاں۔ جھڑکیاں سہے جاؤ۔ یا اپنے لئے کوئی دوسرا رستہ نکالو۔ اب اس عمر میں اماں سے یہ امید کرنا۔ کہ وہ اپنا وتیرہ چھوڑ دیں گی محال کو ممکن سمجھنا ہے۔ بولو کیا منظور ہے"؟

میں نے خائف ہو کر کہا "آپ جو کہئے وہ کروں۔ آئندہ سے نہ پڑھوں لکھوں گی۔ جو کچھ وہ کہیں گی وہی کروں گی۔ اگر وہ اسی میں راضی ہیں۔ تو یہی سہی۔ مجھے پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے"؟

بابو جی۔ لیکن میں نہیں چاہتا۔ اماں نے آج شروعات کی ہے۔ اب وہ روز بروز اور بھی سخت ہوتی جائیں گی۔ میں تمہاری تہذیب و تربیت کی جتنی بھی کوشش کروں گا۔ اتنا ہی انہیں ناگوار ہوگا۔ اور وہ تمہیں پر غصّہ نکالیں گی۔ انہیں یہ خیال کہاں۔ کہ جس آب و ہوا میں انہوں نے پرورش پائی تھی وہ اب نہیں رہی۔ ترقی اور آزادی اور اصلاح کے خیالات ان کے نزدیک کفر سے کم نہیں۔ میں نے ایک حکمت سوچی ہے چل کر کسی دوسرے شہر میں اپنا ڈیرا جماؤں۔ میری پریکٹس بھی یہاں نہیں چلتی۔ دوسری جگہ جانے کے لئے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہے *

میں نے اس تجویز کی زیادہ مخالفت نہیں کی۔ گو اکیلے رہنے کا خیال کچھ کچھ طبیعت سہمتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی آزادیوں کے خیال سے دل میں ایک ولولۂ مسرت پیدا ہوتا تھا +

(۴)

اسی دن سے اماں نے مجھ سے بولنا چالنا ترک کر دیا۔ وہ مہریوں سے میری نندوں سے پڑوسنوں سے میرا مضحکہ اڑایا کرتیں۔ یہ مجھے حد درجہ شاق گزرتا تھا۔ وہ اس کے بدلے مجھے سخت سُست کہہ لیتیں۔ تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ ان کی عزت میرے دل سے کم ہونے لگی کسی کی تضحیک کرنا اس کی نگاہ میں اپنا وقار کھو دینے کا نہایت آسان نسخہ ہے۔ میرے اوپر سب سے سنگین الزام یہ لگایا جاتا تھا۔ کہ میں نے بابو جی پر کوئی موہنی منتر ڈال دیا ہے۔ وہ میرے اشاروں پر چلتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی +

ساون کے دن تھے جنم اشٹمی کا تہوار آیا۔ گھر میں سب نے برت رکھا۔ میں نے بھی حسب عادت برت رکھا۔ ٹھاکر جی کا جنم رات کے بارہ بجے ہونے والا تھا۔ ہم سب بیٹھی گاتی بجاتی رہیں۔ بابو جی کو یہ بیہودہ رسمیں ذرا بھی نہ بھاتی تھیں۔ وہ ہولی کے دن رنگ نہ کھیلتے۔ گانے بجانے کا تو ذکر ہی کیا۔ جب رات کے ایک بجے میں ان کے کمرے میں گئی۔ تو سمجھانے لگے "یوں جسم کو ایذا پہنچانے سے کیا فائدہ؟ کرشن ضرور قابلِ تعظیم بزرگ تھے اور ان کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس برت اور گانے بجانے سے کیا حاصل؟ اس نمائش کا نام مذہب نہیں ہے۔ مذہب کا تعلق ایمان سے ہے۔ نہ کہ نمود سے" بابو جی خود اسی اصول پر عمل کرتے تھے۔ وہ بھگوت

گیتا کی بہت تعریف و تعظیم کرتے۔ لیکن اسے کبھی پڑھتے نہ تھے۔ اپنشدوں کی تعریف میں ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ لیکن میں نے انہیں کبھی کوئی اپنشد کھولتے نہیں دیکھا۔ وہ ہندو مذہب کے فلسفیانہ خیالات پر شیدا تھے لیکن انہیں موجودہ زمانے کے لئے ناموزون سمجھتے تھے بالخصوص وہ ویدانت کو ہندوستان کی تباہی کا خاص سبب خیال کرتے تھے۔ کہتے "اسی ویدانت نے ہم کو چوپٹ کر دیا۔ ہم دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ اور اس کا خمیازہ اب تک اٹھا رہے ہیں۔ یہ مقابلہ اور سرگرمی کا دور ہے ترک اور توکّل کا اُس زمانے میں نباہ نہیں ہو سکتا۔ قناعت نے ہندوستان کو فقیر بنا دیا۔" اس وقت مجھے ان کا جواب دینے کی لیاقت کہاں تھی۔ ہاں اب سوچتی ہوں۔ کہ وہ نئی تہذیب کے طلسم میں پھنسے ہوئے تھے۔ اب وہ خود ایسی باتیں نہیں کرتے۔ مدہوشی کا اثر کچھ زایل ہو چلا ہے +

(۴)

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہم الہ آباد چلے آئے۔ بابو جی نے پہلے ہی سے ایک دو منزلہ مکان لے رکھا تھا۔ تمام کمرے فرش سے آراستہ تھے۔ مختلف قسم کی کرسیاں اور میزیں اور آرائشی سامان جا بجا سجے ہوئے تھے۔ یہاں ہمارے پانچ نوکر تھے۔ دو عورتیں۔ دو مرد اور ایک مہراج۔ اب میں گھر کے کام کاج سے بالکل آزاد ہو گئی۔ بے گاری سے جی گھبراتا تو کوئی نہ کوئی ناول پڑھنے لگتی +

یہاں پھول اور پیتل کے برتن بہت کم تھے چینی کی رکابیاں اور پیالے الماریوں میں سجے ہوئے تھے۔ کھانا میز پر آتا تھا۔ بابو جی بڑے شوق سے کھاتے۔ رفتہ رفتہ میں بھی میز پر کھانے کی عادی ہو گئی۔ حالانکہ پہلے

مجھے بہت شرم آتی تھی۔ ہمارے پاس ایک خوبصورت ٹینڈم بھی تھی۔ اب ہم پیدل بالکل نہ چلتے تھے کسی سے ملنے کے لئے دس قدم بھی جانا ہوتا۔ تو گاڑی تیار کرائی جاتی۔ بابوجی کہتے "یہی فیشن ہے"*

بابوجی کی آمدنی ابھی بہت کم تھی۔ خرچ کا بار نہ سنبھلتا تھا۔ میں انہیں اکثر متفکر دیکھتی۔ اور سمجھاتی۔ کہ "جب آمدنی کافی نہیں ہوتی ہے۔ تو لازمہ اتنا کیوں بڑھا رکھا ہے؟ کوئی چھوٹا سا مکان لے لو۔ دو نوکروں سے بھی کام چل سکتا ہے"۔ لیکن بابوجی میری باتوں پر ہنس دیتے۔ وہ کہتے "ہم اپنے افلاس کا اعلان کیوں کریں (صورت افلاس افلاس سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے) بھول جاؤ۔ کہ ہم غریب ہیں۔ پھر دولت ہمارے پاس خود آئے گی۔ خرچ کا زیادہ ہونا ضرورتوں کا بڑھنا یہی حصول دولت کا پہلا زینہ ہے۔ اس سے ہماری پوشیدہ قوتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ قناعت افلاس کا دوسرا نام ہے"۔ اس لئے ہمارے مصارف روز بروز بڑھتے جاتے تھے۔ ہم ہفتے میں کم سے کم تین دن ضرور تھیٹر دیکھنے جاتے۔ ہفتہ میں کم سے کم ایک دن ضرور ہی دوستوں کی دعوت ہوتی۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ زندگی کا مقصد زندگی سے لطف اٹھانا ہے۔ ایشور ہماری بندگی اور عبادت سے بے نیاز ہے۔ اس نے ہم کو نعمتیں دی ہیں۔ کہ ان سے حظ اٹھائیں۔ یہی اس کی بہترین عبادت ہے۔ مجھے ایک عیسائی لیڈی انگریزی پڑھانے اور گانا سکھانے آنے لگی۔ گھر میں ایک پیانو بھی آ گیا۔ ان دلچسپیوں میں پڑ کر میں راماین بھگت مال کو بھول گئی۔ وہ کتابیں مجھے دقیانوسانہ معلوم ہوتیں۔ دیوتاؤں پر سے بھی میرا اعتقاد اٹھ گیا*

رفتہ رفتہ یہاں لوگوں سے تعلقات پیدا ہونے لگے۔ یہ ایک بالکل

نئی سوسائٹی تھی۔ اس کا طرز گفتگو۔ طرز معاشرت۔ طرز خیال۔ میرے لئے بالکل انوکھا تھا۔ اس سوسائٹی میں میں ایسی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے موروں میں کوا۔ ان لیڈیوں کی بات کبھی تھیٹر پر ہوتی۔ کبھی گھوڑ دوڑ پر۔ کبھی ٹینس پر۔ کبھی انگریزی مصنفین کے کلام پر۔ کبھی اخباروں کے مضامین پر۔ ان کی پھرتی چستی ذکاوت و فراست پر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ علم و روشنی کی پتلیاں ہیں۔ وہ بے نقاب باہر نکلتیں مجھے بھی بار بار اپنے ساتھ کھینچ لے چلنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن میری غیرت اور حیا کبھی مجھے اُن کے ساتھ نہ جانے دیتی۔ میں ان لیڈیوں کو کبھی اُداس یا متفکر نہ دیکھتی۔ مسٹر داس نہایت سخت بیمار تھے لیکن مسز داس کی پیشانی پر ذرا بھی میل نہ تھا مسٹر باگڑا نینی تال میں تپ دق کا علاج کراتے تھے۔ لیکن مسز باگڑا روزانہ ٹینس کھیلنے جاتی تھیں۔ ایسی حالت میں میری کیا حالت ہوتی؟ اسے میں ہی جانتی ہوں *

ان لیڈیوں کے حرکات و سکنات میں ایک جادو تھا۔ جو مجھے بے اختیار ان کی طرف کھینچتا تھا۔ میں انہیں ہمیشہ تفریح و مشاغل پر آمادہ دیکھتی اور میرا بھی جی چاہتا تھا۔ کہ انہیں کی طرح بے باک ہوتی۔ ان کی انگریزی باتیں سُن کر مجھے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ دیویاں ہیں۔ میں اپنی ان خامیوں کے پورا کرنے میں بدل و جان کوشاں تھی *

کچھ دنوں کے بعد مجھے ایک ناگوار تجربہ ہونے لگا۔ بابو جی اب اگرچہ بظاہر پہلے سے بھی زیادہ میری خاطر کرتے۔ مجھے ہمیشہ "ڈیری" یا "ڈارلنگ" کہہ کر پکارتے۔ لیکن مجھے ان کی باتوں میں ایک قسم کا تصنع نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ یہ باتیں ان کے دل سے نہیں۔ زبان سے نکل رہی ہیں۔ ان کی محبت میں بہ نسبت سچائی کے نمود کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ

تعجب کی یہ بات تھی۔ کہ اب مجھے بھی بابو جی پر دہ کا قائل عقیدت نہ رہی تھی اب ان کے ذرا سا سر دُکھنے پر میرا دل نہ دکھتا تھا۔ میری شخصیت کا نشوونما ہونے لگا تھا۔ اب میں اپنا بناؤ سنگار اس لئے کرتی تھی۔ کہ یہ میرا دنیاوی فرض ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں کسی فرد واحد کی پابند ہوں۔ مجھ میں اپنے نشۂ حسن سے مخمور ہونے کا مادہ پیدا ہونے لگا تھا۔ جو نمود حسن کی پہلی منزل ہے۔ ننشاوزندگی کی جو تعلیم بچپن سے دی گئی تھی۔ وہ اب دل سے محو ہونے لگی تھی۔ میں اب کسی دوسرے کے لئے نہ جیتی تھی۔ اپنے لئے جیتی تھی۔ بے نفسی اور قربانی کی اسپرٹ مجھ سے مفقود ہو چلی تھی +

میں اگرچہ اب بھی پردہ کرتی تھی۔ لیکن دادحسن کی ایک نہایت بے تاب کن خواہش مجھے بے چین کیا کرتی تھی۔ ایک روز مسٹر داس اور کئی دیگر احباب بابو جی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے اور ان کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ بابو جی میری اس جھجک سے بہت نادم ہوتے تھے اُسے وہ اپنی شان تہذیب میں ایک داغ سمجھتے تھے۔ شاید وہ دکھانا چاہتے تھے کہ میری بیوی اس لئے پردہ میں نہیں ہے۔ کہ وہ حسن یا لباس میں کسی سے کم ہے۔ بلکہ محض اس لئے کہ ابھی اُسے شرم دامن گیر ہے۔ وہ کسی حیلے سے مجھے بار بار پردہ کے پاس بلاتے۔ تاکہ ان کے دوست میری شکل اور لباس کو دیکھ سکیں۔ آخر کار شوق نمود کچھ دنوں کے بعد حیا پر غالب آیا۔ اور الہ آباد آنے کے پورے دو سال بعد میں بابو جی کے ساتھ بے نقاب سیر کرنے لگی۔ سیر کے بعد ٹینس کی نوبت پہنچی۔ اور آخر میں نے کلب میں جاکر دم لیا۔ پہلے یہ ٹینس اور کلب مجھے ایک تماشا سا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ لوگ ورزش کے لئے نہیں۔ بلکہ فیشن کے لئے ٹینس کھیلتے تھے۔ وہ کبھی

نہ بھولتے تھے۔ کہ ہم ٹینس کھیل رہے ہیں۔ ان کے حرکات میں جھکنے میں۔ اُچکنے میں۔ دوڑنے میں۔ ایک تصنع تھا۔ جو ظاہر کرتا تھا کہ اس کھیل سے ورزش نہیں محض نمود مقصود ہے ۔

کلب میں اس سے بھی بدتر حال تھا۔ وہ نقالی تھی۔ خالص بے میل نقالی۔ لوگ انگریزی کے چُنے ہوئے فقرے بولتے تھے۔ جن میں کوئی معنی نہ ہوتے تھے۔ نقلی ہنسی ہنستے تھے۔ جس کا کوئی محل نہ ہوتا تھا۔ عورتوں کی وہ بھدی بے پردگی۔ مردوں کی وہ بھونڈی نسواں پرستی مجھے ایک دل لگی معلوم ہوتی تھی۔ سارا منظر انگریزی معاشرت کا ایک مرقع تضحیک تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میں بھی وہی رنگ پکڑنے لگی۔ اور وہی پارٹ ادا کرنے لگی۔ اب مجھے اندازہ ہوا۔ کہ شوق نمود میں کتنی زبردست قوت ہے۔ میں اب نت نئے سنگار کرتی۔ نت نئے روپ بھرتی۔ محض اس لئے کہ کلب میں میں ہی سب کی نگاہوں کا مرکز بن جاؤں۔ اب مجھے بابوجی کی آرام و آسائش اور ضرورت کے مقابلے میں اپنے سجاؤ۔ بناؤ کا زیادہ خیال رہتا تھا۔ یہانتک کہ یہ شوق ایک نشہ سا ہوگیا۔ اتنا ہی نہیں داد حسن کے ملنے سے مجھے ایک غرور آمیز مسرت حاصل ہونے لگی۔ میرے احساس غیرت میں بھی ایک عجیب وسعت اور لچک پیدا ہوگئی۔ وہ نگاہیں جو کبھی میرے جسم کا ایک ایک رویاں کھڑا کر دیتیں۔ وہ کنائے اور بذلہ سنجیاں جو کبھی مجھے زہر کھا لینے پر آمادہ کر دیتیں۔ اُن سے اب مجھے ایک شورش انگیز مسرت حاصل ہوتی تھی۔ لیکن جب کبھی میں اپنی حالت پر غور کرتی۔ تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔ یہ ناؤ کس گھاٹ لگے گی۔ ارادہ کرتی کہ اب کلب نہ جاؤں گی۔ مگر وقت آتے ہی اضطراری

طور پر پھر بیدار ہو جاتی تھی۔ نیک ارادہ بالکل کمزور ہو گیا تھا +

بابو جی کے مزاج میں مجھے ایک اور تغیر نظر آنے لگا۔ وہ زیادہ تر خاموش اور متفکر رہنے لگے۔ مجھ سے بہت کم بولتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو انہیں کوئی سخت تردد لاحق ہے۔ یا خدانخواستہ کوئی مرض ہو گیا ہے۔ ان کا چہرہ پژمردہ رہتا تھا۔ نوکروں سے ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے۔ اور باہر بہت کم جاتے۔ ابھی ایک مہینہ پہلے وہ سو کام چھوڑ کر کلب جاتے تھے۔ وہاں گئے بغیر انہیں کل نہ پڑتی تھی۔ لیکن اب وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے اخبار اور کتابیں دیکھا کرتے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ کہ یہ کیا معاملہ ہے +

ایک دن انہیں شدت سے بخار آیا۔ وہ دن بھر بے ہوش پڑے رہے لیکن مجھے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ایک وحشت ہوتی تھی۔ میری طبیعت ایک ناول میں لگی ہوئی تھی۔ ان کے پاس جاتی اور ایک منٹ کے بعد لوٹ آتی ٹینس کا وقت آیا۔ تو میں پس وپیش میں پڑی کہ جاؤں یا نہ جاؤں بہت دیر تک دل میں یہی کشاکش ہوتی رہی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا۔ میرے یہاں رہنے سے یہ اچھے تو ہوئے نہیں جاتے۔ اس لئے یہاں بیٹھے رہنا فضول ہے۔ میں نے اچھے سے اچھے کپڑے پہنے اور ریکٹ لے کر کلب گھر جا پہنچی۔ وہاں میں نے مسز داس اور مسز بانگڑا سے بابو جی کا حال بیان کیا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھرے خاموش بیٹھی رہی۔ جب سب لوگ کورٹ میں جانے لگے۔ اور مسٹر داس نے مجھ سے چلنے کے لئے کہا۔ تو میں ایک آہ سرد بھر کے کورٹ میں جا پہنچی۔ اور کھیلنے میں مصروف ہو گئی +

آج سے تین سال پہلے ایک دن اسی طرح بابو جی کو بخار آگیا تھا

ساری رات بیٹھی انہیں پنکھا جھلتی رہی۔ ایسا جی چاہتا تھا۔ کہ ان کے بدلے مجھے بخار آ جائے۔ لیکن یہ اٹھ بیٹھیں۔ مگر اب دل نمائش کا خوگر ہو گیا تھا۔ اکیلے رہنے کی قابلیت مجھ میں باقی نہ رہی تھی۔ میں حسب معمول رات کو نو بجے لوٹی۔ بابوجی کی طبیعت ہلکی تھی۔ انہوں نے مجھے صرف دبی نگاہ سے دیکھا۔ کروٹ بدل لی۔ لیکن میں لیٹی۔ تو میرا دل بہت دیر تک اس خود غرضی و خود پروری پر مجھے کوستا رہا +

مجھے اب انگریزی ناولوں کے سمجھنے کی استعداد ہو گئی تھی۔ ہماری گفتگو زیادہ تنقید آمیز ہوتی تھی۔ ہمارا معیار تہذیب اب بدرجہا اونچا ہو گیا تھا۔ ہم کو اب اپنے طبقہ سے باہر کسی سے ملنے میں عار ہوتا تھا۔ ہم اب اپنے سے کم رتبہ۔ کم حیثیت آدمیوں سے بولنا کسر شان سمجھتے تھے۔ نوکروں سے بات کرنے میں ہمارا لہجہ بہت تحکمانہ ہوتا تھا۔ ہم انہیں اپنا نوکر سمجھتے تھے۔ اور بس۔ ہم کو ان کے ذاتی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہم ان سے الگ تھلگ رہ کر ان پر اپنا رعب قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہم چاہتے تھے۔ کہ وہ ہم لوگوں کو صاحب سمجھیں۔ ہندوستانی عورتوں کو دیکھ کر مجھے اُن سے نفرت ہوتی تھی۔ وہ مجھے انسانیت سے گری ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ خیر بابوجی کی طبیعت دوسرے دن بھی نہ سنبھلی۔ میں کلب نہ گئی۔ لیکن جب متواتر تین دن انہیں بخار آتا گیا۔ اور مسٹر داس نے مجھ سے بار بار اصرار کیا۔ کہ ایک نرس بلا لو۔ تو میں راضی ہو گئی اُس دن تیمارداری کے بار سے سبکدوش ہو کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ اگر دو دن کلب نہ گئی تھی۔ لیکن میرا دل وہیں رہتا تھا۔ بلکہ اپنی اس بزدلانہ نفس کشی پر غصہ آتا تھا +

ایک دن سہ پہر کے وقت میں آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ایک انگریزی

پڑھ رہی تھی۔ مجھے خیال آیا۔ کہیں بابو جی کا بخار مہلک ثابت ہوا تو ؟ لیکن اس خیال سے مجھے ذرا بھی دہشت نہ ہوئی۔ میں اُس پر ملال تخیل کا مزہ اٹھانے لگی مسز داس۔ مسز ناٹڈو۔ مسز سریواستو یہ۔ مس کھرے۔ مسز شرغہ۔ مس گھوش ضرور تعزیت کرنے آئیں گی۔ انہیں دیکھتے ہی میں آنکھوں میں آنسو بھرے اٹھوں گی " بہنوں میں لُٹ گئی! ہاں میں لُٹ گئی!! اب میری زندگی اندھیری رات ہے۔ یا ہولناک جنگل یا شمع مزار! لیکن میری حالت پر غم کا اظہار مت کرو۔ مجھ پر جو کچھ گزرے گی۔ میں اس کامل انسان کی نجات کے خیال سے بخوشی سہ لوں گی "۔ میں نے ایک طولانی ماتمی تقریر کا مسودہ دل میں تیار کیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس ماتمی لباس کا بھی فیصلہ کر لیا۔ جو میں پہنے ہوئے جنازے کے ساتھ جاؤں گی۔ اس سانحے کا سارے شہر میں چرچا ہو جائیگا۔ سارے کنٹونمنٹ کے لوگ تعزیت کے خطوط بھیجیں گے۔ تب میں اخباروں میں ایک خط چھپوا دوں گی۔ کہ " میں فرداً فرداً اپنے ہمدردوں کے تعزیت ناموں کا جواب دینے سے معذور ہوں۔ دل پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ میں اس ہمدردی کے لئے ان کی تہ دل سے مشکور ہوں۔ اور اُن سے التجا کرتی ہوں کہ وہ مرنے والے کے حق میں دعائے مغفرت کریں "۔

میں انہیں خیالات میں محو تھی۔ کہ نرس نے آکر کہا۔ کہ آپ کو صاحب یاد کرتے ہیں۔ یہ میرے کلب جانے کا وقت تھا۔ مجھے ان کا بلانا ناگوار گزرا۔ لیکن طوعاً و کرہاً گئی۔ بابو صاحب کو بیمار ہوئے ایک ماہ کے قریب ہو گیا تھا۔ وہ بہت نحیف ہو رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف التجا کی نگاہ سے دیکھا۔ اس میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ مجھے اُن پر رحم آگیا۔ بیٹھ گئی۔ اور ہمدردانہ انداز سے بولی " کیا کروں؟ کوئی دوسرا ڈاکٹر بلاؤں ؟ "

بابو صاحب نے آنکھیں نیچی کر کے نہایت مستمندانہ انداز سے کہا " میں یہاں ہرگز اچھا نہ ہوں گا۔ مجھے اماں کے پاس پہنچا دو"۔

میں نے کہا " کیا آپ سمجھتے ہیں۔ کہ وہاں آپ کا علاج یہاں سے اچھا ہوگا؟"۔

بابوجی بولے " کیا جانے کیوں میرا جی اماں کو دیکھنے کو چاہتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں وہاں بلا دوا کے اچھا ہو جاؤں گا"۔

میں " یہ آپ کا محض خیال ہے"۔

بابوجی " شاید خیال ہی ہو۔ لیکن میری عرض قبول کرو۔ میں اس بیماری سے نہیں۔ اس زندگی سے بیزار ہوں"۔

میں نے تعجب کی نگاہ سے ان کی طرف دیکھا۔

بابوجی پھر بولے " ہاں میں اس زندگی سے بیزار ہوں۔ مجھے اب معلوم ہو رہا ہے۔ کہ میں جس درخشاں لہراتے ہوئے تختۂ آب کی طرف دوڑا جاتا تھا۔ وہ جھلسی ہوئی ریگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میں اس معاشرت کے ظاہری لوازمات پر شیدا تھا۔ لیکن اب مجھے اس کی اصلی صورت نظر آرہی ہے۔ ان دو سالوں میں میں نے اس باغیچے کی خوب سیر کی۔ اور اسے اوّل سے آخر تک خارزار پایا۔ یہاں نہ اطمینانِ قلب ہے۔ نہ رُوحانی مسرت۔ یہ ایک ہیجان۔ ہلچل۔ ذلّت غلامی۔ بے رحمی۔ خود غرضی۔ ریاکاری۔ نقالی۔ خود ستائی۔ اور تن پروری کی زندگی ہے۔ یہاں نہ اخلاق ہے نہ مذہب۔ نہ ہمدردی، نہ شرا[illegible] پرماتما کے لئے مجھے اس آگ سے بچاؤ۔ اگر اور کچھ نہ ہو سکے۔ تو ایک خط لکھ دو۔ وہ ضرور آئیں گی۔ اپنے بدنصیب لڑکے کی حد دیکھی جائے گی۔ انہیں ابھی اس معاشرت کی ہوا نہیں لگی۔ و

کی وہ مادرانہ شفقت سے بھری ہوئی نگاہ۔ اُن کی محبت آمیز دل جوئی و تیمارداری میرے لئے سو دواؤں کا کام کرے گی۔ ان کے چہرے پر وہ نور نظر آئے گا۔ جس کے لئے میری آنکھیں ترس رہی ہیں۔ ان کے دل میں محبت ہے! ایمان ہے۔ عقیدت ہے۔ ان کی آغوش میں میں مر بھی جاؤں گا۔ تو میری روح کو تسکین ہوگی +

میں نے سمجھا۔ یہ بخار کا ہذیان ہے۔ نرس سے بولی " ذرا ان کا ٹمپریچر تو لو۔ میں ابھی ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوں " میرا دل ایک نامعلوم خوف سے کانپنے لگا۔ نرس نے تھرمامیٹر نکالا۔ لیکن جوں ہی وہ بابو جی کے قریب گئی۔ انہوں نے اُس کے ہاتھ سے وہ آلہ چھین کر زمین پر پٹک دیا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور میری طرف ملامت آمیز انداز سے دیکھ کر کہا " صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو۔ کہ میں کلب گھر جا رہی ہوں۔ جس کے لئے تم نے یہ لباس زیب تن کیا ہے۔ اور گاڑی تیار کرائی ہے۔ لیکن اگر ادھر سے گھومتی ہوئی ڈاکٹر کے پاس جاؤ تو کہہ دینا۔ کہ یہاں حرارت اس نقطے پر ہے۔ جہاں آگ لگ جاتی ہے "

میرا خوف اَور بھی زیادہ ہو گیا۔ اور دل پر ایک رقت سی طاری ہو گئی۔ گلا بھر آیا۔ بابو جی نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور اُن کی سانس زور سے چل رہی تھی۔ میں دروازے کی طرف چلی کہ کسی کو ڈاکٹر کے پاس بھیجوں۔ یہ لتاڑ سن کر خود کیسے جاتی؟ کہ بابو جی اُٹھ بیٹھے۔ اور منت آمیز انداز سے بولے۔ "شیاما! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ دو ہفتوں سے ارادہ کر رہا ہوں۔ کہ کہوں۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ پر آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ کہہ ہی ڈالوں گھر جا کر وہی پہلے کی سی زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں۔ مجھے نفرت ہو گئی ہے۔ اور یہی میری بیماری کا خاص سبب ہے۔

میرا عارضہ جسمانی نہیں روحانی ہے۔ میں پھر تمہیں وہی پہلے کی سی شرمیلی۔ نیچا سر کر کے چلنے والی۔ پوجا کرنے والی۔ رامائن پڑھنے والی۔ گھر کے کام کاج کرنے والی۔ ایشور سے ڈرنے والی۔ حیادار عورت دیکھنا چاہتا ہوں مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کروگی۔ میں تمہیں سولھوں آنے اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ اور سولھوں آنے تمہارا بننا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوگیا۔ کہ اسی سادہ۔ پاک اور بے تکلف زندگی میں میری نجات ہے۔ بولو منظور ہے؟ تم نے ہمیشہ میری باتیں مانی ہیں۔ اس وقت مایوس نہ کرنا۔ اگر تمہیں میری جان پیاری ہے تو ضرور ماننا۔ ورنہ معلوم نہیں اس کوفت اور کلفت کا کیا انجام ہو"

میں یکایک کوئی جواب نہ دے سکی۔ سوچنے لگی۔ اس آزاد زندگی میں کتنا لطف تھا۔ یہ دل چسپیاں وہاں کہاں؟ کیا اتنے دنوں آزادی سے ہوا میں اُڑنے کے بعد پھر اُسی قفس میں جاؤں؟ وہی لونڈی بن کر رہوں؟ کیوں؟ مجھے اس وقت بابوجی سے ہمدردی نہ ہوئی۔ اُن پر طبیعت جھنجھلائی۔ بہ تلون طبعی کیوں؟ انہیں نے مجھے برسوں آزادی کا سبق پڑھایا۔ برسوں تک دیوتاؤں کی۔ رامائن کی۔ گنگا کی۔ پوجا پاٹ کی۔ برت کی ہجو کی۔ ہنسی اُڑائی۔ اور اب جب کہ میں ان باتوں کو بھول گئی۔ انہیں وہم باطل سمجھنے لگی۔ تو پھر مجھے اس زندان خانے میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ میں ان کی مرضی پر چلتی ہوں اس دائرہ میں دوسری عورتیں جو کچھ کرتی ہیں۔ وہی میں کرتی ہوں۔ پھر شکایت کا کیا موقع؟ لیکن بابوجی کے چہرے پر ایسی ترحم انگیز لجاجت تھی۔ کہ میں علانیہ انکار نہ کر سکی۔ بولی "آخر آپ کو یہاں کیا تکلیف ہے"؟ میں ان کے دل کی بات جاننا۔ ان کے خیالات کے مخزن کا پتہ لگانا چاہتی تھی +

بابوجی پھر اُٹھ بیٹھے۔ اور میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر بولے" بہتر ہوتا۔ کہ تم یہ سوال مجھ سے پوچھنے کے بدلے اپنے دل سے پوچھتیں۔ کیا اب میں تمہارے لئے وہی ہوں۔ جو آج سے تین سال قبل تھا؟ جب میں تم سے زیادہ تعلیم یافتہ۔ زیادہ سمجھ دار۔ زیادہ واقف کار ہو کر تمہارے لئے وہ نہیں رہا۔ جو پہلے تھا۔ تم نے اُسے چاہے محسوس نہ کیا ہو۔ لیکن میں خود سمجھ رہا ہوں۔ تو میں یہ کیونکر باور کروں۔ کہ وہی اثرات تمہارے دل پر غالب نہ آئے ہونگے۔ نہیں بلکہ علامات ظاہر کر رہی ہیں۔ کہ تمہارے دل پر یہ اثر اور بھی زیادہ ہوا ہے۔ تم نے اپنے تئیں نمائش تکلف اور خود پرستی کے بھنور میں ڈال دیا ہے۔ اور اپنے انجام سے بالکل بے خبر ہو۔ اب مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ تہذیب آزادی کا بھوت عورت کے کم زور دل پر زیادہ آسانی سے غالب آسکتا ہے۔ کیا ممکن تھا۔ کہ تین سال قبل بھی تم مجھے اس حالت میں چھوڑ کر کسی پڑوسی کے گھر گانے بجانے چلی جاتیں؟ میں بستر پر پڑا کراہا کرتا۔ اور تم کسی کے گھر جا کر خوش گپیاں کرتیں! عورت کی طبیعت انتہا پسند واقع ہوئی ہے لیکن اس نئی انتہا کی بہ نسبت مجھے وہ پرانی انتہا بدرجہا بہتر نظر آتی ہے۔ اُس انتہا کا نتیجہ روحانی و جسمانی نشوونما اور قلب کی صفائی۔ اس انتہا کا نتیجہ ہے چھچھورا پن۔ بے شرمی۔ بے حیائی۔ اور خود روی۔ اس وقت اگر تم مسٹر داس کے رو برو یوں بے باکی سے ہنستیں۔ تو میں یا تو تمہیں مار ڈالتا۔ یا خود زہر کھا لیتا۔ لیکن بے غیرتی اس زندگی کا خاص عنصر ہے۔ میں سب کچھ دیکھتا ہوں۔ اور برداشت کرتا ہوں۔ اور غالباً سہے جاتا۔ اگر اس بیماری نے میری آنکھیں نہ کھول دی ہوتیں۔ اب اگر تم یہاں بیٹھی رہو۔ تو مجھے تسکین نہ ہوگی۔ کیونکہ مجھے یہ خیال ستاتا رہیگا

بلکہ تمہارا دل یہاں نہیں ہے۔ میں نے اپنے تئیں اس طلسم سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جہاں دولت کا نام عزت ہے۔ تکلف کا نام تہذیب ہے۔ اور نخوت کا نام شرافت! بولو منظور ہے؟"

میرے دل پر ایک بجلی سی کوند گئی۔ بابو جی کا منشا ذہن میں آگیا۔ ابھی دل میں کچھ پرانی غیرت باقی تھی۔ بے شرمی کا الزام قوتِ تحمل سے باہر تھا۔ حیا کا احساس زندہ ہو گیا۔ نگاہ باطن کی طرف گئی۔ اس پر پردہ تھا۔ مگر خفیف۔ دل نے کہا "بے شک! میں اب وہ نہیں ہوں۔ جو پہلے تھی اُس وقت یہ میری نگاہوں میں دیوتا تھے۔ میں اُن کی مرضی کو مقدم سمجھتی تھی۔ اب یہ میری نگاہوں میں ایک بہت معمولی درجہ کے انسان ہیں" مسٹر کراس کی تصویر نگاہ کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ آہ! کل اس ظالم کی باتوں سے میرے دل پر کیسا نشہ چھا گیا تھا۔ یہ یاد کرکے میری آنکھیں ندامت سے جھک گئیں۔ بابو جی کے دل پر جو کچھ گزر رہی تھی۔ ان کے چہرے سے صاف عیاں تھا۔ تمام خود غرضانہ خیالات میرے دل سے محو ہو گئے۔ اور وہاں یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے نظر آئے "تو نے فیشن اور لباس میں ضرور ترقی کی ہے۔ تجھ میں اپنے حقوق کا احساس زیادہ ہو گیا ہے۔ تجھ میں زندگی کی مسرتوں سے حظ اٹھانے کی قابلیت زیادہ ہو گئی ہے۔ تو اب زیادہ دلیر زیادہ مستقل مزاج۔ زیادہ باعلم ہو گئی ہے۔ لیکن تیری روحانی ہستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ تو اپنے فرائض بھول گئی ہے"۔

میں نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ اور بابو جی کے پیروں پر گر پڑی۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ آنسو کی جھڑی لگ گئی۔

(۵)

اب میں پھر اپنے گھر پر آگئی ہوں - اماں جان اب میری زیادہ عزت اور خاطر کرتی ہیں - بابوجی اب بہت زیادہ مطمئن نظر آتے ہیں - وہ اب خود بھی روزانہ سندھیا کرتے ہیں +

مسز داس کی چٹھیاں کبھی کبھی آتی ہیں - اُن میں الہ آبادی سوسائٹی کی تازہ ترین خبریں ہوتی ہیں - مسٹر کراس اور مس بھاٹیا کے متعلق اتہام آمیز افواہیں اُڑ رہی ہیں - میں ان خطوط کا جواب تو دے دیتی ہوں - پر چاہتی ہوں کہ وہ نہ آتے - تو اچھا ہوتا - وہ ان دنوں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں جنہیں میں بھول جانا چاہتی ہوں +

کل بابوجی نے بہت سی پرانی ردّی جلائی - ان میں امیلی زولا اور آسکر وائلڈ کی کئی کتابیں تھیں - وہ اب انگریزی کتابیں کم پڑھتے ہیں - کارلائل - رسکن اور ایمرسن کے سوا میں انہیں کوئی دوسری کتاب نہیں پڑھتے دیکھتی اور مجھے تو اپنی رامائن اور مہابھارت میں پھر وہی لطف آنے لگا ہے +

(پریم بتیسی حصہ دوم)

M-H-A.

اِعترافِ گناہ

(از جناب محمد ہادی حسین صاحب صدیقی۔ بی۔ اے۔ آنرز)

کُھلے دروازے کے سامنے، میں کوئی ایک لمحہ تک پس و پیش کے عالم میں کھڑا رہا۔ لیکن جب بڑھیا نے، جو مجھے وہاں تک لائی تھی، دوبارہ کہا کہ "یہی جگہ ہے" تو میں اندر گیا۔

پہلے پہل تو میں ایک دھندلے سے، فانوس پوش لمپ کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکا، لیکن ذرا دیر کے بعد مجھے دیوار پر ایک لمبے پتلے جسم کا بے حرکت سایہ نظر آیا۔ کمرہ پیٹرول اور پتھر کی بدبو سے معمور تھا۔ صرف چھت کی سلیٹوں پر بارش کے پڑنے کی آواز سنائی دیتی تھی، یا ٹھنڈی چمنی میں سے گذرتی ہوئی ہوا کا غمگین ترنم، ورنہ چاروں طرف ایک سکوتِ مزار طاری تھا۔

"موسیو!" بڑھیا کسی چیز پر جُھک کر (جو مجھے بعد میں معلوم ہُوا کہ ایک بستر ہے) ملائمت کے لہجہ میں بولی: "موسیو! جن صاحب سے آپ ملنا چاہتے تھے وہ یہاں تشریف لے آئے ہیں"۔

سایہ اٹھتا ہوا نظر آیا۔ اور ایک نحیف سی آواز سُنائی دی۔ کہ بہت خوب . . . . جاؤ۔ میڈم تم جاؤ"۔

جب بڑھیا دروازہ بند کر کے چلی گئی تو آواز آئی: "موسیو۔ میرے نزدیک آجائیے۔ میں تقریباً اندھا ہوں۔ میرے کانوں میں ہر وقت سنسناہٹ

سی رہتی ہے۔ مجھے بہت کم سنائی دیتا ہے۔ یہاں میرے پاس ہی ایک کرسی ہوگی۔ اس تکلیف دہی کی معذرت چاہتا ہوں لیکن مجھے آپ سے ایک نہایت ضروری بات عرض کرنی ہے"

میری طرف مڑتے ہوئے چہرے کی آنکھیں ٹکٹکی لگائے مجھے گھور رہی تھیں۔ بوڑھا کانپتا ہوا بولا "لیکن پہلے یہ بتائیے۔ کیا آپ موسیو گرینبو ہیں۔ کیا میں موسیو گرینبو سرکاری وکیل سے مخاطب ہوں؟"

"ہاں"

اُس نے ایک اطمینان کا سانس لیا

"تو پھر میں آخر اپنے گناہ کا اقبال کر سکتا ہوں۔ میں نے خط پر اپنا نام پیریئر لکھا تھا۔ لیکن اصل میں میرا نام یہ نہیں ہے۔ اگر قریب آئی ہوئی موت نے میری قلب ماہیت نہیں کر دی تو آپ مجھے کچھ نہ کچھ ضرور پہچان سکتے ہیں۔۔ ۔۔۔۔ لیکن خیر کوئی مضائقہ نہیں +

کچھ برس ہونے کو آئے۔ بلکہ بہت عرصہ گذرا، میں حکومتِ جمہوری کا سرکاری وکیل تھا۔ میں ان معدودے چند اشخاص سے تھا جن کی بابت زبانِ خلق کی پیشینگوئی یہ ہوا کرتی ہے کہ "اس کا مستقبل شاندار ہوگا"۔ اور میں نے اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کا ارادہ صمیم دل سے کر رکھا تھا۔ میرا اظہارِ قابلیت صرف ایک موقع کا محتاج تھا۔ وہ موقع مجھے عدالت سشن کے ایک مقدمے کی صورت میں مل گیا۔ جرم ایسا تھا کہ اگر وہ پیرس میں رونما ہوتا تو کسی خاص توجہ کا جاذب نہ بنتا۔ لیکن اُس مختصر سے قصبے میں اُس سے بڑی سنسنی پھیلی روز عدالت میں مقدمے کی رُوئداد پڑھ کر سنائی گئی، مجھے محسوس ہوا کہ مل نہیں، بڑی بحث و تکرار کا موضوع ہوگا۔ ملزم کے خلاف شہادت

بڑی زبردست تھی لیکن اس میں وہ فیصلہ کن عنصر مفقود تھا جس کی موجودگی میں ملزم کے لئے عموماً اقبالِ جرم کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ملزم نے اپنی معصومیت کو کچھ ایسے پیرائے میں بیان کیا کہ حاضرین جلسۂ عدالت کے دلوں پر شک اور ہمدردی کا ایک مخلوط جذبہ طاری ہوگیا۔ اور آپ ایسے جذبے کی اثر ریزی سے بخوبی واقف ہیں۔

"لیکن ایسے جذبات مجسٹریٹ پر کوئی اثر مرتب نہیں کرسکتے۔ میں نے ملزم کے منکرانہ بیان کے جواب میں ایسے ایسے واقعات بیان کئے جن سے شہادت کی ایک مسلسل زنجیر سی تیار ہوگئی۔ میں نے ملزم کی زندگی کے کل سوانح عدالت کے پیش نظر کر دیئے اس کی ساری کمزوریوں اور برائیوں کو بے نقاب کر دیا جیوری کے سامنے میں نے جرم کا مرقع بڑی نفاست سے کھینچا اور پھر جس طرح شکاری کتا شکاریوں کو ساتھ لے کر شکار کے غار کے پاس جاتا ہے۔ اسی طرح میں نے بھی آخیر میں ملزم کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "مجرم یہی ہے"۔

پیروکار صفائی نے میری دلیلوں کے [illegible]ے۔ اپنی بساط بھر اس نے میرا مقابلہ کیا۔ لیکن محض بے سود۔ میں بدی کے سر کا سائل تھا اور وہ مجھے مل گیا۔

وہ تھوڑی بہت ہمدردی جو میرے د[illegible]ئے جاگزین ہوگئی تھی، میرے غرور بلاغت کے سامنے بہت [illegible]د نہ رہ سکی۔ عدالت کا فیصلہ قانون کی اور خود میری ایک مہتم بالش[illegible]۔

میں نے اس آدمی کو سزایابی کے دن پھر دیکھا جلاد اس وقت اسے جگا کر قتل گاہ کی طرف لے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

جب میں نے اس کے مایوس چہرے کی طرف نظر کی، میرے دل کو ایک شدید صدمہ پہنچا۔ اُس خوفناک وقت کی ہر ہر بات میرے دماغ میں اب تک تازہ ہے۔ جب انہوں نے اس کے دست و پا کو زنجیر و سلاسل میں جکڑ دیا۔ تو وہ بالکل خاموش رہا۔ اُس کی طرف دیکھنے کی مجھے جرات نہ ہوتی تھی۔ اُس کی سکوں ریز آنکھیں ایک عجیب اندازِ سکوت سے میری طرف جمی ہوئی تھیں جب وہ زندان کے دروازے سے باہر آکر گلوٹین کے سامنے کھڑا ہوا، اس نے دو مرتبہ چلّا کر کہا "میں بے گناہ ہوں۔ میں بے گناہ ہوں" اور وہ لوگ جو اُسے مرکزِ لعنت و ملامت بنانے پر آمادہ کھڑے ہوئے تھے۔ چُپ کے چُپ رہ گئے۔ پھر وہ میری طرف رجوع ہوا اور بولا "مجھے قتل ہوتا دیکھو۔ یہ تمہاری محنت کا انعام ہے"۔ وہ اپنے پادری اور وکیل سے لپٹ گیا ...... کچھ ایسے یاد آتا ہے کہ پھر وہ خود بخود گلوٹین پر جا چڑھا اور انتظارِ موت کے انجام پذیر نہ ہونے والے لمحہ کے لئے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے، چاقو کا انتظار کرتا ہوا، تختہ پر پڑا رہا۔ میں سر برہنہ پاس کھڑا تھا .... مجھے کچھ دھندلا دھندلا خیال ہے .... کیونکہ میں کچھ بھی نہ دیکھ رہا تھا، میرا دماغ ایک لمحہ کے لئے تو بالکل سُن ہو ہوگیا تھا۔

اس کے بعد کے دنوں میں ایک خاص تکلیف نے میرے جسم کو بے حس و حرکت کر دیا۔ میرا دماغ اس قدر پریشان ہو گیا کہ اس تکلیف کا باعث معلوم کرنے سے قاصر تھا۔ اس شخص کی موت کا خیال ایک بے نام سے بوجھ کی طرح ہر وقت میرے دل پر رہتا تھا۔ ساتھی وکیلوں نے مجھ سے کہا کہ 'شروع شروع میں ایسا ہی ہُوا کرتا ہے'۔

میں نے ان کی بات کا اعتبار کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہو گیا کہ میری تکلیف کی ایک وجہ ہے ...... شک! ...... جس لحظہ سے مجھے یہ علم ہوا میری راحتِ جگر کافور ہو گئی۔ ذرا سوچو تو سہی کہ ایک مجسٹریٹ کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہو گی جب وہ کسی کے قتل کا حکم دینے کے بعد اپنے دل میں سوچتا ہو گا کہ

"شاید وہ مجرم نہ ہو"

میں نے اپنی تمام طاقت اس خیال کو رفع درفع کرنے میں صرف کر دی میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ یہ خیال محض بیہودہ ہے۔ میں نے استدلال کی مدد سے اپنے دل و دماغ کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہا، لیکن میری تمام دلیلیں اس ایک سوال کے آگے رد ہو جاتی تھیں کہ کوئی اصلی ثبوت بھی تھا کہ نہیں؟ تب میں اُس شخص کے واپسیں لمحوں کی سوچ میں محو ہو جاتا۔ اس کی پُرسکون آنکھیں میرے سامنے آجاتی تھیں اور اس کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔

"اور ایک دن اُسی قتل گاہ کا دردانگیز سماں میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا کہ کسی نے مجھ سے کہا: "اس شخص نے اپنی صفائی نہایت خوبی سے پیش کی تھی۔ بڑی حیرت خیز بات ہے کہ وہ بری نہ ہو سکا .... یقین جانو کہ اگر میں تمہاری آخری دلیل نہ سنتا تو میں یہی سمجھے رہتا کہ وہ معصوم تھا۔"

تو گویا میرے زورِ بیان کی سحر طرازی اور میری مقدمہ جیتنے کی مستقل خواہش نے اس تماشائی کے شکوک رفع کر دیئے تھے۔ شاید جیوری کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو ..... اگر ایسا ہے پھر تو میں ——— صرف میں ——— اُس

آدمی کی موت کا جواب دہ ہونگا۔ اور اگر وہ ناکردہ گناہ مارا گیا۔ تو پھر اس کا خون میری گردن پر سوار ہے ؛

کوئی شخص کسی الزام کو چپکے سے نہیں لے لیتا۔ وہ کوئی نہ کوئی مدافعانہ کوشش ضرور کرتا ہے۔ اپنے ضمیر کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کرنا چاہتا ہے اس خیال سے میں نے مقدمہ کے کاغذات کو از سر نو دیکھنا شروع کیا۔ تمام دستاویزات و تحریرات کے دوبارہ دیکھنے کے بعد بھی میں اُسی پہلے نتیجے پر پہنچا۔ لیکن وہ تمام تحریرات، تمام دستاویزات میرے ہی متعصب دماغ کی تیار کردہ تھیں۔ میری ہی ہوس ترقی کی زائیدہ، اور اس شخص کو مجرم ثابت کرنے کی ضرورت کا نتیجہ تھیں ؛

پھر میں نے مقدمہ کے دوسرے پہلوؤں کی طرف توجہ کی۔ ملزم سے کئے ہوئے سوالوں کے جواب دیکھے گواہوں کی شہادتیں پڑھیں۔ چند نکات ہنوز حل طلب تھے، اُن کے سمجھنے کو میں محلِ واردات پر گیا۔ میں نے قاتل کے استعمال کردہ ہتھیار کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ کوئی بیس مرتبہ میں نے تمام امور پر غور وخوض کی۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ بے چارہ معصوم تھا ؛

اور پھر تاسف کی سلگتی آگ کو بھڑکا دینے کے لئے مجھے چند روز بعد ایک عہدۂ جلیلہ عطا کیا گیا ـــــ آہ۔ یہ میری انتہائی دناءت کا تحفۂ عوض تھا!

موسیو! میں نہایت ضعیف دل واقع ہوا تھا۔ میں نے بغیر اظہار سبب کے استعفا دیکر اپنے زعم میں یہ فرض کر لیا کہ بس گناہ کا کفارہ ہو گیا۔ میں نے ایک دور دراز سفر شروع کیا۔ لیکن افسوس! دل کا گم کردہ سکون طول

طویل سفروں سے حل نہیں سکتا +

اب میری زندگی کا مقصدِ وحید یہ ہو گیا کہ جس طرح ہو سکے اُس نا انصافی کی تلافی کروں لیکن وہ آدمی کوئی آوارۂ بے خانماں تھا۔ اس کا نہ کوئی رشتہ دار تھا نہ مونس۔ اس حالت میں مجھے ایک ہی بات زیبا تھی۔ وہ یہ کہ میں اپنی خطا کاری کو صاف صاف مان لیتا۔ مگر نہیں مجھے اس کی ہمت کہاں؟ —— یہ خوف کیا کم تھا کہ میرے ہم پیشہ واقف کار مجھ پر خفا ہوں گے، مجھے ہدف استہزا بنائیں گے!

آخر کار میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنے سرمایہ کو محتاجوں اور مجرموں کی حاجت روائی اور کشودِ کار میں صرف کر دوں۔ بھلا مجھ سے زیادہ اور کون اُن تیرہ بختوں کو قانون کے سخت گیر شکنجے سے بچانے کا کفیل تھا؟ میں نے زندگی کے تمام لذائذ و مسرات سے مغائرتِ کلی اختیار کر لی۔ اہل دنیا کی نظروں سے اوجھل تنہائی میں رہتا رہا۔ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنے لوازم زندگی کو بہت کم کر دیا ہے۔ مہینوں میں اس تاریک خلوت خانہ میں پڑا رہا ہوں۔ اس مرض الموت میں بھی یہیں مبتلا ہُوا، اور آرزومند ہوں کہ یہیں مروں + — اور ہاں اب میں نفس مدعا عرض کرتا ہوں؟

اس کی آواز اس قدر دھیمی ہو گئی تھی کہ مجھے اس کی باتوں کا مفہوم اس کے کپکپاتے ہُوئے ہونٹوں سے کان لگا کر ہی سمجھنا پڑتا تھا +

میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ میری کہانی بھی مدفونِ فراموشی ہو جائے میری تمنا ہے کہ آپ اسے اُن اشخاص تک پہنچا دیں جن کا فرض مقتضائے انصاف کی رُو سے مجرموں کو سزا دینا ہے۔ آپ اُن پر واضح کر دیں کہ

ملزموں کو ضروری طور پر سزا دینے کا خیال کس قدر ہولناک ہے۔ آپ یہ بات سرکاری وکیلوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں کہ جب وہ کسی ملزم کو سزا دلانے کھڑے ہوں تو اس بات کا لحاظ رکھیں کہ مبادا کوئی ناقابل تلافی غلطی سرزد ہو جائے۔"

میں نے اُسے یقین دلایا کہ "آپ کی ہدایت پر ضرور کاربند رہوں گا"

اس کا چہرہ نیلگوں اور سیاہ ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تھرتھرا رہے تھے۔

وہ بولا "لیکن محض یہی نہیں ..... میرے پاس ابھی کچھ روپیہ ہے .... جسے میں کسی مصرف میں نہیں لا سکا ..... وہ وہاں میز کے خانہ میں پڑا ہے ..... میرے بعد اُسے غریبوں میں تقسیم کر دینا .... میرے نام سے نہیں، اُس شخص کے نام سے جو آج سے تیس برس پیشتر میری غلطی کا شکار ہوا تھا ..... یہ تمام روپیہ اُسی رینل کے نام سے تقسیم کر دینا۔"

میں چونک اُٹھا۔

"رینل۔ لیکن اس کا وکیل تو میں تھا۔ میں نے ......"

اُس نے اپنا سر ہلایا۔

میں جانتا ہوں۔ اسی لئے تو میں نے آپ کو بُلایا تھا۔ آپ کے آگے تو مجھے اپنے گناہ کا اعتراف کرنا لازمی تھا۔ میں ڈبوروکس سابق سرکاری وکیل ہوں۔"

اس نے اپنے بازوؤں کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی وہ زیر لب آہستہ سے بولا "رینل .... رینل ....."

شاید میں نے اپنے پیشہ کا ایک راز فاش کر دیا۔ اور ایک ایسے قاعدے

کی خلاف ورزی کی جس پر عمل پیرا ہونا میرا فریضۂ واجبی تھا۔ لیکن اُس مرتے ہوئے شخص کی قابل رحم حالت نے میرے مُنہ سے بے اختیار نکلوا ہی دیا:۔

"موسیو ڈیوروکس۔ موسیو ڈیوروکس ۔۔ ربنل دراصل مجرم تھا۔ اُس نے قتل گاہ کو جانے سے پہلے اس کا اقبال کر لیا تھا مجھ سے رخصت ہوتے وقت اُس نے سب کچھ مجھے بتا دیا تھا۔"

لیکن وہ تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ میں ہمیشہ یہ یقین کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ اُس نے میری آخری بات ضرور سُن لی تھی +

(ترجمہ)

پری

(۱)

راجکمار بیس سال کا ہوگیا۔ ملک ملک سے شادی کے پیغام آنے لگے۔ جوتشی نے کہا "بالھیک کی راجکماری نہایت حسین ہے۔ جیسے گلاب کا پھول ہو"۔ راجکمار نے منہ پھیر لیا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔

سفیر نے حاضر ہوکر عرض کی "قندھار کی شاہزادی کے ہر عضو سے حسن پھوٹا پڑتا ہے۔ گویا انگور کی بیل ہے جس سے خوشہ ٹپکے پڑتے ہیں"۔ راجکمار اسی روز شکار کو چلا گیا۔ کئی دن ہوگئے واپس نہ آیا۔

دوسرے سفیر نے کہا "کمبھوج کی راجکماری کو دیکھ آیا ہوں"۔

راجکمار بھرتری کے کلام کے مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔ کتاب سے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

راجہ نے کہا "بات کیا ہے؟ وزیر زادہ کو بلواؤ"۔

وزیر زادہ حاضر ہوا۔ اس کے باریاب ہوتے ہی بادشاہ نے دریافت کیا۔ "تم شاہزادے کے دوست ہو۔ یہ بتاؤ کہ شادی سے اُسے نفرت کیوں ہے؟"

وزیر زادے نے عرض کی "حضور! شاہزادے نے جب سے پرستان کا

قصہ سُنا ہے۔ انہوں نے عہد کرلیا ہے۔ کہ اگر میں شادی کروں گا تو پری سے کروں گا۔"

(۲)

بادشاہ نے حکم دیا کہ پرستان کا پتہ لگایا جائے۔ بڑے بڑے پنڈت اور ماہرین فن حاضر ہوئے۔ انہوں نے ضخیم جلدوں کی ورق گردانی کی۔ مگر سب نے یہی کہا کہ ان کتابوں میں پرستان کا اشارہ تک نہیں۔ بڑے بڑے تاجر اور سیاح طلب ہوئے۔ انہوں نے عرض کیا "خشکی اور تری کا سفر ہم نے کیا خوبصورت سے خوبصورت جزیرے ہم نے دیکھے۔ مگر پرستان ہم کو کہیں نہ ملا" اب حکم ہوا کہ وزیر زادہ حاضر کیا جائے۔ اس کے حاضر ہوتے ہی ارشاد ہوا "پرستان کا قصہ شاہزادے نے کس سے سُنا ہے؟"

وزیر زادے نے دست بستہ عرض کی "ایک پاگل سے جو ہاتھ میں بانسری لئے جنگلوں میں پھرا کرتا ہے۔ اسی نے شاہزادے کو پرستان کی کہانی سُنائی تھی۔"

بادشاہ نے کہا "اچھا! اسی پاگل کو بُلواؤ۔"

پاگل، بادشاہ کے نذرانہ کے لئے ایک مٹھی میں جنگلی پھول لئے دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اس سے دریافت کیا "کیا تم پرستان کا حال جانتے ہو؟"

اُس نے کہا "جی ہاں! میں تو روز وہاں آیا جایا کرتا ہوں۔"

بادشاہ نے پوچھا "کہاں ہے؟"

پاگل نے جواب دیا "یہیں آپ کے راج میں چنر گری پہاڑ کے نیچے کا میک جھیل کے کنارے۔"

"کیا وہاں پریاں دکھائی دیتی ہیں۔"

پاگل "دکھائی تو دیتی ہیں لیکن ان کا پہچاننا مشکل ہے۔ وہ اپنا بھیس بدلے رہتی ہیں۔ بعض وقت جب وہ چلی جاتی ہیں، تو بتاتی ہیں کہ ہم پریاں ہیں۔ پھر وہ کسی کو نہیں مل سکتیں۔"

بادشاہ "تم انہیں کیسے پہچانتے ہو؟"

پاگل "کبھی نغمہ سنکر اور کبھی نور دیکھ کر۔"

بادشاہ نے خفا ہو کر کہا "پاگل ہے۔ پاگل پن کی باتیں کرتا ہے۔ نکالو یہاں سے۔"

(۳)

مگر پاگل کی باتیں شاہزادے کے دل پر نقش ہو گئی تھیں۔

پھاگن میں بسنت آئی۔ درختوں کی ٹہنیاں شگوفوں سے لد گئیں جنگل میں پھولوں کا فرش بچھ گیا۔ راجکمار چترگری پہاڑ کی طرف تن تنہا چل کھڑا ہوا۔ لوگوں نے پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے؟" اس نے کسی کو جواب نہ دیا۔

غار کے منہ سے ایک چشمہ ابلتا تھا۔ جو کاسیک جھیل میں جا ملتا تھا۔ لوگ اس چشمہ کو "حسرتوں کا چشمہ" کہا کرتے تھے۔ اسی چشمہ کے کنارے ایک منہدم شدہ مندر میں شاہزادہ رہنے لگا۔

مہینہ ختم ہو گیا۔ شاخوں میں جو سرخ کونپلیں پھوٹی تھیں۔ اب ہری پتیاں ہو گئیں۔ ان کا رنگ گہرا ہو گیا۔ پھول جھڑ گئے۔ اور ان پھولوں سے جنگل کا راستہ پٹ گیا۔ ایک دن صبح صبح شاہزادے نے بانسری کی ایک لے سنی اس نے خوشی سے اچھل کر کہا "آج میں ضرور پری کو دیکھ لونگا۔"

(۴)

گھوڑے پر سوار ہو کر راجکمار اسی دریا کے کنارے چل کھڑا

ہُوا۔ اور کامیک جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ایک پہاڑی لڑکی کنول کے جنگل میں بیٹھی ہے۔ اُس کا گھڑا پانی سے بھرا رکھا ہے۔ مگر وہ وہاں سے اٹھتی نہیں۔ وہ سیاہ فام لڑکی اپنے سیاہ بالوں میں سریشں کا پھول لگائے ہوئے ہے۔ گویا شام کی سیاہی میں کوئی تارا چمکتا ہو ۔

راجکمار نے اپنے گھوڑے پر جھک کر کہا "تم اپنے جوڑے کا پھول مجھے دو گی؟"

وہ ہرنی تھی۔ خوف سے ناآشنا ہرنی تھی۔ اس نے مُڑ کر شاہزادے کی طرف دیکھا۔ اُس کی سیاہ آنکھوں پر کسی کا سایہ پڑا۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ گویا نیند میں خواب ہے یا آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہے ۔

لڑکی نے اپنے جوڑے سے پھول نکال کر راجکمار کے ہاتھ میں دیا۔ اور کہا "یہ لو"

راجکمار نے اُس سے پوچھا "سچ بتاؤ تم کونسی پری ہو؟"

پہلے تو اس سوال سے لڑکی کے چہرے پر تعجب کے آثار نظر آئے۔ لیکن پھر کنوار کی بارش اور بجلی کی طرح اُس نے قہقہہ لگایا۔ اس کی یہ ہنسی رُکتی ہی نہ تھی ۔

راجکمار نے اپنے دل میں کہا "خواب مبارک نکلا۔ اس قہقہہ میں بانسری کی لَے ہے"۔ پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر کہا "آؤ"

لڑکی اس کے ہاتھوں کے سہارے گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ اُس نے مطلق نہ سوچا۔ کہ میرا گھڑا پڑا ہے۔ ٹھیک اسی وقت سریشں کی شاخ سے کوئل کوک اٹھی "کُو۔ اُو"

راجکمار نے لڑکی سے پُوچھا "تمہارا کیا نام ہے"

لڑکی نے کہا "کجلی"۔

دونوں چشمہ کے کنارے ٹوٹے مندر میں لوٹ آئے۔

شاہزادے نے کہا "اب اپنا بھیس اُتار پھینکو"۔

کجلی نے کہا "میں تو جنگلی لڑکی ہوں بھیس ویس نہیں جانتی"۔

شاہزادے نے کہا "تم پری ہو۔ اپنی اصلی صورت دکھاؤ"۔

پری کی شکل! یہ سنتے ہی لڑکی ہنسنے لگی۔ راجکمار سوچنے لگا "اس قہقہے کی لے جھرنے کی لے سے ملتی ہے۔ اس لئے یہ جھرنے کی پری ہے"۔

(۵)

ادھر راجہ کو خبر پہنچی کہ شاہزادے نے پری سے شادی کرلی ہے۔ شاہی محلوں سے ہاتھی گھوڑے اور پالکی آئی۔

کجلی نے پوچھا "یہ کیا ہے"؟

راجکمار نے کہا "اب تمہیں شاہی محلوں کو چلنا پڑے گا"۔

کجلی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ سوچنے لگی "آنگن میں سوکھنے کے لئے جو غلہ پھیلا تھا وہ ویسا ہی پڑا ہے۔ میرے باپ اور بھائی شکار کو گئے تھے۔ ان کے لوٹنے کا بھی وقت ہوگیا ہے"۔ پھر اُسے یاد آیا "میری ماں شادی کے وقت جو کپڑا دینا چاہتی ہے۔ وہ بُن رہی ہے"۔

اُس نے کہا میں نہ جاؤنگی"۔

نقاروں پر چوبیں پڑنے لگیں۔ ڈھول بجنے لگے۔ نقاروں کے شور اور ڈھول کی آواز میں اس کی بات کسی نے نہ سُنی۔

جب اُس کی پالکی محل کے دروازہ پر پہنچی۔ اور وہ نیچے اُتری تو رانی نے اپنے سر پر دوہتھڑ مار لئے۔ کہا "یہ کیسی پری ہے"؟

شاہزادیاں کہنے لگیں "توبہ! کتنی شرم کی بات ہے"
کنیزوں نے کہا "پری کی صورت کیسی؟"
راجکمار نے کہا "چپ رہو۔ پری تمہارے یہاں بھیس بدل کر آئی ہے"

(۶)

دن گزرتے گئے۔ چاندنی راتوں میں شاہزادہ اٹھ اٹھ کر کہتا۔ کہ کہیں پری نے اپنا بھیس اتار تو نہیں ڈالا۔ مگر چاند کی روشنی میں اس کا جسم ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا سنگ موسے کا بنا ہوا ہے۔ شاہزادہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا "اے پری تو رات کی تاریکی میں صبح کی سپیدی کی طرح کہیں چھپی ہوئی ہے"

شاہزادے کو اپنے گھر والوں سے شرم آنے لگی۔ ایک دن غصہ بھی آگیا۔ صبح کو کجلی جب اپنے بستر سے اٹھی تو شاہزادے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "آج تمہیں نہ چھوڑوں گا۔ اب تم اپنی اصلی شکل دکھاؤ"

پہلے یہ سن کر کجلی کی ہنسی نہ رکتی تھی۔ لیکن آج اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے!

شاہزادے نے کہا "کیا تم ہمیشہ ہم کو دھوکے میں رکھوگی"
کجلی "نہیں اب نہ رکھونگی"

شاہزادے نے کہا۔ اب کی چاند کی چودھویں کو ہم تمہاری اصلی شکل دیکھیں گے"

(۷)

چودھویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ شاہی محلوں میں نوبت بج رہی تھی لیکن دیوالی کی رات تھی۔ شاہزادہ دولھے کے کپڑے زیب تن کئے خوابگاہ میں داخل

سوچ رہا تھا۔" پری کے نظارے سے آج میری آنکھیں ٹھنڈی ہونگی"۔
خواب گاہ میں پلنگ پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی اس پر جوہی کے سفید پھول بکھرے ہوئے تھے۔ چاند کی سفید روشنی سے سارا کمرہ جگمگا رہا تھا مگر کھلی کہاں؟ رات کے تین پہر گذر گئے۔ لیکن پری کہاں ہے؟ شاہزادے نے کہا:۔

"جب پری غائب ہو جاتی ہے تو وہ یہ ثابت کر دیتی ہے۔ کہ میں پری ہوں۔ اور پھر اُسے کوئی نہیں پا سکتا"۔

اپنے ر

جاں نثار

(از جناب سدارشن صاحب)

دیوالی کی رات تھی، زمین آسمان بنی ہوئی تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی۔ چراغوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جیسے آسمان کے تاروں کا شمار نہیں مگر یہی چاندنی (؟) رات ہے۔ جب ہزاروں حریص ہاتھ خیالی ثروت کی آرزو میں اپنا اثاثہ لٹا بیٹھتے ہیں۔ اور پھر اپنی حماقت پر بیٹھے روتے ہیں انسان محنت نہیں کرنا چاہتا مگر اس کے شیریں پھل کھانا چاہتا ہے۔ امید عقل کو دھوکا دے جاتی ہے۔ پورن چند بھی اسی سندر سے مسحور ہو چکا ہے۔ وہ دن رات جوا کھیلتا رہتا تھا۔ اور دیوالی کے قریب آکر تو اُسے کھانے پینے کی سُدھ نہ رہتی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ کسی نہ کسی دن نصیبہ چمک اُٹھیگا۔ امید ہر بار یاس کی صورت اختیار کرتی تھی۔ مگر پورن چند حوصلہ نہ ہارتا تھا۔ اور قسمت کے بساط پر برابر پانسہ پھینکتا جاتا تھا۔ وہ ایک دفتر میں خزانچی تھا۔ دیوالی قریب آئی۔ تو دفتر سے غیر حاضر رہنے لگا۔ مگر مہینے کے آخری دنوں میں دفتر جانا ضروری ہو گیا۔ عملہ کی تنخواہوں کا بل تیار کرنا تھا۔ حسن اتفاق سے دیوالی یکم نومبر کو تھی۔ ۳۱۔ اکتوبر کو تنخواہوں کا روپیہ آیا۔ مگر پورے چار بجے کلرک گھر جا چکے تھے۔ تنخواہ اُس دن تقسیم نہ ہو سکی لیکن پورن چند نے تنخواہ اسی وقت لے لی اور خوش خوش گھر چلا۔ دیوالی کی رات

کا سامان مہیا ہو گیا تھا۔ رات کو جب لکشمی پوجا ہو چکی۔ تو وہ دیپ مالا دیکھنے کے بہانے گھر سے چلا۔ اور جوئے خانہ میں جا پہنچا۔ بدقسمتی پہلے ہی انتظار کر رہی تھی جاتے ہی سب کچھ ہار گیا۔ اب اس کی حالت اُس پرندہ سے مشابہ تھی۔ جو مصروف پرواز ہونے سے پہلے ہی پر تیغ ہو چکا ہو۔ اس وقت اس کی بے بسی کیسی دلخراش ہوتی ہے۔ وہ اُڑنا چاہتا ہے۔ مگر اپنے کترے ہوئے پَروں کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتا ہے! اور تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ پورن چند کو ایسا معلوم ہُوا گویا دیوالی کی رات کے ساتھ ہی اس کی خوش نصیبی بھی رخصت ہو رہی ہے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر کہیں سے روپیہ ملنے کی صورت نظر نہ آئی۔ یکایک اُس کے دل میں ایک خیال نے سر اُٹھایا امید سامنے کھڑی دکھائی دی . . . . . . عملہ کی تنخواہوں کے روپے دفتر میں موجود تھے اور وہ خزانچی تھا +

پورن چند پر نشہ سا چھا گیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں دفتر کی طرف روانہ ہُوا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ چراغوں کی بہار میں خزاں کے پہلو نمودار ہو رہے تھے۔ بازاروں کی رونق کم ہو رہی تھی۔ مگر پورن چند کی آنکھیں اس طرف سے بند تھیں۔ وہ اس طرح بھاگتا ہُوا جا رہا تھا جیسے کسی عزیز بیمار کے لئے کوئی ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہو۔ دفتر میں پہنچا تو چوکیدار دکھائی دیا۔ پورن چند کا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ چوکیدار نے پوچھا "کون ہے؟"

"مَیں ہوں گنگا دین! کہو کیا حال ہے؟"

گنگا دین نے آواز سے فوراً پہچان لیا اور آگے بڑھ کر بولا "آئیے بابو صاحب بجار میں تو خوب رونق رہیو ہے۔ آپ ایہاں کیسے آ گئے؟"

پورن چند کا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر زبان پر پورا پورا قابو تھا ہنس کر بولا "کچھ کاغذ بھول گیا ہوں۔ ذرا دروازہ کھول دے"۔

گنگا دین نے فوراً تعمیل کی۔ اگر کوئی اور ہوتا۔ تو شاید وہ انکار کر دیتا مگر پورن چند خزانچی تھا۔ اُس سے کچھ عذر نہیں کیا۔ بعض دفعہ بیٹنگی کی ضرورت آ بنتی تھی۔ پورن چند کمرے میں پہنچا۔ اور روشنی کر کے میز کے سامنے ہو بیٹھا اس وقت اس کی عقل اس طرح بیتاب تھی۔ جیسے کبوتر شکرے کے پنجے میں پھنس گیا ہو۔ بار بار خیال آتا تھا کہ یہ قدم تباہی کی طرف لیجانے والا ہے مگر اس تاریکی میں امید کا دلفریب چہرہ بھی کبھی کبھی نظر آجاتا تھا۔ آخر پورن چند پر شیطان کا جادو چل گیا۔ اُس نے تجوری کھول کر چار سو کے نوٹ جیب میں ڈال لئے۔ اور کمرہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ اس وقت اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کامیابی کا ایک مرحلہ طے ہو چکا ہے۔ حالانکہ اُس کا ہر ہر قدم اُسے سرزمین کامرانی سے دُور لئے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اُسی جوئے خانہ میں تھا۔ جہاں قسمتیں برباد ہوتی ہیں اور تباہی ہنستی ہے۔ اُمید اُسے رستہ دکھا رہی تھی۔ مگر بدقسمتی اوٹ میں کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ پورن چند نے پھر داؤ لگائے اور پھر سب کچھ ہار گیا۔ اب چاروں طرف تاریکی تھی لیکن اس تاریکی سے زیادہ خوفناک وہ سپیدئی سحر تھی۔ جو آہستہ آہستہ نزدیک سرک رہی تھی۔ اس سپیدی سے پورن چند اتنا خائف تھا کہ اس کے تصور ہی سے اُس کی روح کانپ جاتی تھی سوچتا تھا۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی۔ کہ کل صبح کا سُورج ہی طلوع نہ ہو۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ پورن چند گھر پہنچا۔ اس وقت اس کے پاؤں ایسے لڑکھڑا رہے تھے جیسے شراب پی رکھی ہو۔ اس کا باپ رائے صاحب

سر جن لل امیر آدمی تھا۔ مگر اس کی امارت سے زیادہ مشہور اس کے بخل کے قصے تھے۔ پورن چند کو کئی بار خیال آیا کہ چل کر اُن کے سامنے ساری بات ظاہر کر دوں تو یقیناً وہ مجھے چار سَو روپیہ دینے سے انکار نہ کرینگے۔ مگر پھر سوچا۔ کہ یہ نہیں ہوگا۔ اگر ایسے نصیب ہوتے تو وہ مجھے کوئی کارخانہ نہ کھول دیتے۔ ناحق ذلیل ہونے سے کیا حاصل؟ کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیے اب اُسے عقل آگئی تھی، امید کوئی دھوکا نہ دے سکی۔ اُس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ مگر صبح ہوئی تو اُس کا چہرہ قدرے بحال ہو چکا تھا ایک گناہ پر پردہ ڈالنے کے لئے نئے گناہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس وقت اس کا خیال اپنے نوکر رونقی کی طرف تھا۔

(۲)

رائے صاحب کے تین نوکر تھے۔ ان میں رونقی سب سے پرانا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ رائے صاحب ہی کی خدمت گزاری میں صرف کیا تھا۔ اس لئے رائے صاحب اُسے سخت سُست نہ کہتے تھے۔ رونقی کو بات چیت کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ بولتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا لٹر رہا ہے۔ کام کرنے سے بھی جہاں تک ہو سکتا کترا جاتا تھا۔ ہاں دوسرے ملازموں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں بہت ہوشیار تھا۔ اور اس کام کو ایسی مستعدی سے سرانجام دیتا کہ ملازم بلبلا اُٹھتے تھے۔ رونقی کی اس مستعدی کے خلاف رائے صاحب کے پاس اکثر اپیلیں دائر ہوتی رہتی تھیں۔ مگر رائے صاحب رونقی کے فیصلوں کو عموماً بحال ہی رکھتے تھے۔ اس سے رونقی کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا تھا۔ اکڑ کر کہتا "مکھی کا دمیرا، تم نے کیا بگاڑ لیا"۔

مگر رونقی میں کوئی بات نہ ہو۔ یہ بات نہ تھی۔ وہ مالک کے لئے جان

تک نثار کرنے کو تیار رہتا تھا۔ رائے صاحب کو اس پر روپے پیسے کے معاملہ میں کامل طور پر اعتماد تھا۔ ان کو اس امر کا یقین ہوگیا تھا کہ رونقی مرتا مر جائیگا۔ مگر ایک پائی کی بھی بے ایمانی نہیں کرے گا۔ کئی مواقع ایسے آئے، جب رونقی چاہتا تو سینکڑوں روپے بالا بالا اُڑا سکتا تھا، ترغیب نے سنہری جال بچھائے مگر رونقی نے اپنی طبیعت کو ڈانواڈول نہیں ہونے دیا۔ وہ پرائے روپے کو مٹی کے برابر سمجھتا تھا۔ رونقی کی اس خوبی نے اس کے تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔

(۳)

دیوالی کے دوسرے دن صبح کے وقت رونقی اپنے کمرے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور آنکھیں بند کئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اتنے میں پورن چند بھاگا بھاگا اندر آیا اور بولا "رونقی مجھے بچالو"

آواز میں حسرت تھی، الفاظ میں گھبراہٹ، رونقی کے ہاتھ سے حقہ چھوٹ گیا۔ اُسے پورن چند سے انتہا درجہ کی الفت تھی۔ اُس نے اُسے گودیوں میں کھلایا تھا۔ وہ رات کے وقت عموماً بے سُدھ پڑا سوتا رہتا تھا۔ مگر جب کبھی پورن چند بیمار ہو جاتا۔ تو ساری ساری رات اُس کے سرہانے بیٹھ کر کاٹ دیتا تھا۔ کئی آدمیوں نے اُسے زیادہ تنخواہ پر اپنے ہاں لے جانا چاہا مگر پورن چند کے خیال سے اُس نے سب جگہ انکار کر دیا۔ اور اُسی جگہ پڑا رہا۔ اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ مگر وہ پورن چند سے پدرانہ شفقت رکھتا تھا جس طرح جنگل کے درخت کو پانی دینے والا اُس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح رونقی پورن چند اور اس کے مستقبل سے محبّت کرنے لگا تھا۔ جب اُسے عمر میں بڑا ہوتے دیکھتا

تو اس پر روحانی سرور سا چھا جاتا تھا۔ گویا وہ اس کا نوکر نہیں بلکہ باپ تھا۔ جب وہ کبھی تنہائی میں بیٹھتا۔ تو پورن چند ہی کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ وہ اس وقت بھی اسی کے خیال میں محو تھا۔ سوچتا یہ تھا کہ رائے صاحب جلد اس کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتے۔ رائے صاحب کی دُور اندیشیاں اُس کے لئے بخل سے کم نہ تھیں۔ اچانک پورن چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ گھبرا کر بولا "کیوں سرکار! معاملہ کا ہے"؟

(۴)

یہ کہتے کہتے اُس نے کونے میں پڑی ہوئی لاٹھی اُٹھالی اور اس طرح تیار ہو گیا۔ جیسے پورن چند کے تعاقب میں کوئی خوفناک ڈاکو آرہا ہو۔ پورنچند کے غمگین چہرے پر ایک لمحہ کے لئے ہنسی نمودار ہوئی۔ جیسے رات کو آسمان میں جگنو چمک جاتا ہے۔ اُس نے آہ سرد بھری اور کہا "رونقی لاٹھی رکھدو اس کی ضرورت نہیں"۔

رونقی کے سینہ سے بوجھ اتر گیا۔ لاٹھی رکھتے ہوئے بولا "تو سرکار ایسی کیا آپھت آئی ہے۔ جو مُوں سوکھ گیو ہے"۔

پورن چند نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے چور چوری کرنے سے پہلے دیکھتا ہے۔ انتہائے فکر نے اُس کے ہوش و حواس باختہ کر دیئے تھے۔ اس کو اندیشہ تھا۔ کہ کہیں کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ آہستہ سے بولا "میرے سر پر سچ مچ آفت ہی آگئی ہے تم چاہو تو مجھے بچا سکتے ہو کہو۔ میرا ایک کام کرو گے"؟

رونقی نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا "ہجور حکم دیں تو مگھی (میں) بھاڑ میں کُود پڑے"۔

پورن چند کا چہرہ منور ہو گیا۔ تاریکی یاس میں شعاعِ اُمید چمک گئی تھی۔ اُس نے جیب سے ایک ہار نکالا۔ اور رونقی کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ یہ بازار لے جاؤ اور بیچ آؤ۔ مجھے ابھی روپے کی ضرورت ہے"۔

رونقی پر بجلی سی گر پڑی۔ ہار دیکھ کر وہ اس طرح سہم گیا۔ جیسے کسی سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ اُس کی زبان بند ہو گئی دماغ میں ہزاروں خیالات سما گئے رہ رہ کر سوچتا تھا کہ پورن چند کو ایسی کیا ضرورت آپڑی ہے۔ جو ہار بیچنے کی نوبت آئی ہے۔ اور پھر وہ غریب آدمی نہیں۔ رائے صاحب چاہیں تو آدھا شہر خرید سکتے ہیں۔ اُن کو زیور فروخت کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ رونقی سمجھ گیا کہ پورن چند یہ کام رائے صاحب سے چھپا کر کر رہا ہے۔ اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ بحرِ خیالات میں بہت دیر تک غوطے کھانے کے باوجود اُسے ساحل نہ مل سکا۔ اُس نے عجیب نادانستہ سے پورن چند کی طرف دیکھا۔ نگاہوں میں دل رکھا ہوا تھا۔ پورن چند اُسے تذبذب میں پڑے ہوئے دیکھ کر پھر گھبرا گیا۔ شعاعِ اُمید آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

رونقی نے پوچھا "سرکار! ماملہ کا ہے اِتنی جرورت کیا بن گئی۔ جو ہار بیچو ہو؟"

پورن چند کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہار جیب میں ڈال کر واپس چلنے لگا۔ اس وقت اس کا چہرہ حسرت کی زندہ تصویر تھا۔ رونقی کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔

"سرکار تم کو کِتنے روپے کی جرورت ہے؟"

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ پورن چند۔

"چار سُو کی"۔

"رُوپا کب چاہیئے؟"

"ابھی"

رونقی کے پاس چھ سُو کے قریب روپیہ موجود تھا۔ یہ روپیہ اُس نے کئی سالوں میں جمع کیا تھا۔ وہ ساری تنخواہ گھر نہیں بھیج دیا کرتا تھا۔ تین چار روپے ماہوار بچا رکھتا تھا۔ یہ روپے اُس نے اپنی کوٹھری کے ایک کونے میں دبا رکھے تھے۔ رونقی نے سوچا۔ کہ ہار لے کر بازار میں کہاں بیچتا پھروں گا۔ اپنے پاس سے روپے دیدوں تو کیا حرج ہے۔ پورن چند کوئی اس طرح ہمیشہ تھوڑے ہی تنگدست رہے گا۔ جب اُس کے ہاتھ چار پیسے آئیں گے۔ تو اُس سے اپنا روپیہ واپس لے کر ہار لوٹا دوں گا۔ اس وقت اُس کا کام چل جائیگا۔ یہ سوچ کر۔ اُس نے پورن چند کے ہاتھ سے ہار لے لیا اور کہا "اچھا سرکار! تمرا کام کر دینگے"

پورن چند کی جان میں جان آگئی۔ اُس کو ایسا معلوم ہُوا۔ گویا رونقی اُس کا نوکر نہیں بلکہ فرشتۂ رحمت ہے۔

(۵)

تھوڑی دیر کے بعد رونقی نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے ...س وقت اُس کا دل سینہ میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے ...کی تھی۔ بدنیتی نہیں کی تھی۔ مگر پھر بھی اُس کا کلیجہ کانپ رہا ...چاہتا تھا کہ پورن چند کا کام ہو جائے اور اُسکو ہیڈ صاحب ...اعتراف نہ کرنا پڑے۔ وہ ہر چند کہ جاہل اَن پڑھ ...ہو گیا تھا کہ اگر پورن چند کا یہ قصور جس کے بارے

وہ تاحال تاریکی میں تھا۔ رائے صاحب کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ تو پورنچند کا مستقبل خراب ہو جائے گا اس خیال سے اس کا خون خشک ہُوا جاتا تھا وہ سب کچھ برداشت کر سکتا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی زمین کھودی، روپیہ گن کر نکالا اور زمین پھر سے ہموار کر دی۔ اس وقت اس کے چہرے پر پھر وہی بے فکری و اطمینان کا رنگ ہویدا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورن چند امید و بیم کی صورت بنا ہُوا آیا۔ اور ہچکچاتے ہوئے بولا "رونقی"

رونقی حقہ پی رہا تھا۔ اُس نے زبان سے کوئی جواب نہ دیا مگر ہاتھ سے اپنے سرہانے کی طرف اشارہ کر دیا۔ پورن چند نے روپیہ دیکھا تو تنِ مُردہ میں جان آگئی۔ رونقی کی طرف احسانمندی کے انداز سے دیکھتے ہوئے چلا گیا۔

یکایک رونقی چونک پڑا۔ جیسے کسی کی کوئی قیمتی شے گم ہو جاتی ہے۔ وہ زمین کھودتے وقت ہار دبانا بھول گیا تھا۔ وہ تیر کی طرح تیزی سے اپنی چارپائی کے سرہانے پہنچا۔ ہار وہیں پڑا تھا۔ سوچنے لگا اب اسے رات کو دبانا چاہئے۔ دن میں کسی کو شبہ بھی ہو گیا۔ تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے اُس نے ہار کمر کے گرد لپیٹ لیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ مگر طبیعت میں سارے دن انتشار رہا۔

رات ہو گئی تھی رونقی نے دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ مگر ہاتھوں میں سکت نہ تھی دل اس طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے کوئی سپاہی گرفتار کرنے کو آرہا ہو جسم برسوں کے مریض کے مانند شل ہو رہا تھا۔ یہ ہونے والے واقعات کا پیش خیمہ تھا۔ پر رونقی اس سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہ چلتے تھے۔ مگر وہ زمین کھود

رہا تھا۔ یکایک کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ رونقی کے وسوسے پورے ہو گئے گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور سننے لگا کہ کیا یہ میرا وہم ہی تو نہیں دروازے پر پھر کسی نے ہاتھ مارا۔ رونقی کے چہرے پر پسینہ کے قطرے نمودار ہو گئے۔ سردی کے دن تھے، مگر اُس کا دم گھٹا جا رہا تھا تاہم اُس نے حوصلے سے پوچھا۔

"اس وقت کون ہے؟"

"دروازہ کھول دے۔"

رونقی کا چہرہ فق ہو گیا یہ رائے صاحب کی آواز تھی۔ جو حالت بکری کی شیر کی دھاڑ سُن کر ہوتی ہے وہی حالت اس آواز کو سُن کر رونقی کی ہوئی اُسے اپنی رسوائی آنکھوں کے سامنے ناچتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس نے بولنا چاہا۔ مگر گلے سے آواز نہ نکل سکی۔ رائے صاحب نے کڑک کر کہا "دروازہ کھول دے۔"

رونقی نے لپک کر ہار بستر کے نیچے چھپا دیا ٹمٹماتا ہوا دیا بجھا دیا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ اُس وقت اُس کے پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے رائے صاحب نے اندر آتے ہی کہا "دیا کیا ہوا؟"

رونقی نے جواب دیا "سرکار بجھائے دیو۔"

"ابھی تو جل رہا تھا۔ بجھائے کیسے دیو؟ فوراً روشن کرو۔"

رونقی کے اندیشے مادی صورت اختیار کر رہے تھے۔ حیل و حجت کرنے لگا وہ چاہتا تھا کہ یہ وقت ٹل جائے۔ تو بعد میں سینکڑوں بہانے تراشے جا سکتے ہیں۔ وقت اخفائے جرم کے لئے بہترین امداد ہے۔ مگر رائے صاحب نے اس کی مہلت نہ دی۔ جیب سے دیا سلائی نکال کر خود چراغ جلایا۔ اور زمین کی طرف دیکھ کر بولے "یہ تو کیا کر رہا تھا؟"

رونقی نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا "سرکار جو مہینہ ملتا ہے۔ اُس سے بچائے بچائے کر کسی بکت کے لئے تھی یہاں کچھ داب دبا کرتا ہوں"

"مگر آج کیا دابنے لگا تھا۔ ابھی تو تنخواہ بھی نہیں ملی"

چھوٹی زبان بند ہوگئی۔ رونقی رائے صاحب کا منہ دیکھنے لگا۔ رائے صاحب نے آگے بڑھ کر زمین سے مٹی ہٹائی اور روپوں کی پوٹلی دیکھی پھر بستر ہلایا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید رونقی نے جوا کھیلا ہے کیونکہ اُس سے اور کسی بے ایمانی کی انہیں مطلقاً توقع نہ تھی۔ مگر انہیں یہ دیکھ کر کیسی حیرت ہوئی۔ کہ رونقی کے بستر کے نیچے ہار پڑا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھے۔ اگر کوئی دوسرا شخص یہی فعل کرتا۔ تو رائے صاحب ممکن ہے در گذر کر جاتے۔ مگر رونقی کو اس حالت میں دیکھ کر اُن کا خون جوش مارنے لگا۔ انہوں نے نہایت نرمی سے جو سخت غصے سے بھی خوفناک ہوتی ہے پوچھا! "یہ ہار کیسے اُڑایا؟ یہ تو ابھی چند ہی دن ہوئے خریدا تھا"۔

رونقی میں خواہ لاکھوں عیب تھے۔ مگر وہ چور نہ تھا۔ اس صفت کے لئے رائے صاحب اس کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ اس وقت اس کی وہ تمام نیکنامی مٹی میں ملنے کو تھی۔ رونقی نے سوچا۔ اب تمام واقعہ صاف صاف کہہ دینا چاہیئے۔ پورن چند آخر رائے صاحب کا بیٹا ہے۔ اُسے کھا تو نہ جائیں گے۔ یہ سوچ کر اس نے حوصلہ مندی کے انداز سے سر اٹھایا اور ہاتھ باندھ کر جواب دیا سرکار! معاملہ یوں ہے کہ . . . .

اتنے میں اس کی نگاہ پورن چند پر پڑی۔ وہ اس طرح کانپ رہا تھا۔ جیسے کسی کو بخار چڑھ رہا ہو۔ اُس نے ایک عجیب انداز سے رونقی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ رونقی کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے پورن چند نے

اُسنے کہا ہے۔ آخر تم کمینہ نکلے مَیں نے تم پر اعتبار کیا تھا۔ مگر تم اس کے ناقابل ثابت ہوئے۔ کاش مَیں یہ پہلے سے سوچتا تو اس وقت رسوا نہ ہوتا،

جس طرح ہوا کا رُخ بدلنے سے پتنگ کا رُخ بدل جاتا ہے۔ اُسی طرح اس نگاہ سے رونقی کا ارادہ تبدیل ہوگیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ خود بدنام ہونگا مگر پورن چند پر حرف نہ آنے دونگا۔ یہ سوچ کر اُس نے رائیصاحب سے کہا۔ "سرکار معاملہ یو ہے کہ مَیں نے چوری کری ہے"

رائیصاحب اُس کی چارپائی پر بیٹھ گئے اِس وقت اُس کو ایسا افسوس ہُوا گویا ہزاروں کا نقصان ہوگیا ہے مگر پورن چند دل ہی دل میں اس پر عش عش کر رہا تھا۔ دنیا میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جو اپنی غرض کے لئے دن رات جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ مگر دوسروں کے لئے جھوٹ بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

رائیصاحب نے تھوڑی دیر سکوت کیا اور پھر کہا۔ تم صبح ہونے سے پہلے پہلے میرے مکان سے نکل جاؤ۔ بس یہی تمہاری سزا ہے"

رونقی اور پورن چند دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

(۶)

اس کے ایک سال بعد رائیصاحب سرجن مل کا انتقال ہوگیا۔ اب سارے روپے پیسے کا پورن چند ہی مالک تھا۔ اُس نے کریا کرم سے فارغ ہو کر رونقی کے نام چار سَو روپیہ کا منی آرڈر بھجوایا۔ اور ساتھ ہی خط لکھا کہ تم فوراً میرے پاس آجاؤ۔ مگر ایک ہفتہ کے بعد منی آرڈر واپس آگیا۔ ساتھ اُس کے بھائی کا خط آیا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ اُسے مرے ہوئے ایک سال گذر گیا ہے۔ وہ جب آپ کے ہاں سے آیا تو ہمیشہ اداس رہا۔ یہی اُداسی اس کے

چہرے سے وہ واپسین تک نہیں گئی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اُسے کوئی روگ ہے۔ مگر کیا روگ ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔

پورن چند پر اس خط کا ایسا اثر ہوا۔ کہ کئی دن تک روتا رہا۔ اب اُس نے جوا کھیلنا ترک کر دیا ہے۔ اور رونقی کے نام پر ایک دھرم سالہ بنوا دی ہے اور اس میں اس کی قد آدم تصویر رکھی ہے۔ لوگ اُس کی حماقت پر ہنستے ہیں مگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ رونقی کی جاں نثاری کے مقابلہ میں اتنی وقعت بھی نہیں رکھتا۔ جتنی ذرہ آفتاب کے مقابلہ میں*

(ہمایوں)

عشّاق عرب

عبداللہ ابن علقمہ و حبیشہ

دنیائے حسن و عشق میں جو خصوصیت عرب کو حاصل ہے شاید ہی کسی دوسرے ملک کو نصیب ہوگی "مجنوں لیلےٰ" "قیس ولبنیٰ" "نصیب و ثینہ" وغیرہ جیسی ہزارہا عشق نواز ہستیاں پیدا کرنے کا فخر اسی خشک اور ریتلے خطہ کو حاصل ہے +

عرب کے قبیلہ "بنی قحطان" کا ایک خوبصورت نوجوان عبداللہ ابن علقمہ بھی انہیں فدائیان عشق سے تھا۔ ایک بار وہ کسی کام سے بنی جذیمہ کے قبیلہ میں اپنے شناسا سعد ابن اسلم کے یہاں گیا۔ سعد بن اسلم نوجوان کے ساتھ خاطر تواضع سے پیش آیا۔ اور اُس سے نہایت اخلاق کے ساتھ باتیں کرنے لگا +

تھوڑی دیر میں ایک نازک بدن پُرشباب لڑکی چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے خیمہ سے نکل کر اونٹنی کا دودھ دوہنے لگی۔ دودھ دوہتے وقت ہوا کا ایک سخت جھونکا آیا اُس کے چہرہ سے نقاب سرک گئی اور سارا چہرہ ظاہر ہوگیا۔ ابن علقمہ نے "ماہ دو ہفتہ" کے شرمانے والے چہرہ کو دیکھا تو ہوش وحواس کھو بیٹھا اور بالکل بے خود ہوگیا۔ ذرا دیر بعد ہوش آیا۔ تو اس خیال

سے کہ مبادا دوسرے لوگ اس حالت سے واقف ہو جائیں اس تاثر کو دُور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

جبیشہ دودھ دوہ کر ایک پیالہ میں ابن علقمہ کے پاس لائی نوجوان کی اس وقت عجیب کیفیت ہوئی سارے جسم میں خفیف سا لرزہ پڑ گیا۔ ہاتھ کانپ کر بے قابو ہو گئے! اور دودھ بھرا پیالہ زمین پر آ رہا۔

جبیشہ اس اضطراری کیفیت کو دیکھ کر معاً سمجھ گئی کہ اُسی کے "برقِ حسن" نے نوجوان کے خرمن عقل پر بجلی گرائی ہے۔ نوجوان بھی اپنے مردانہ حسن میں یگانۂ روزگار تھا۔ جبیشہ بھی جسم و عشق کے پاک جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اور اس طرح دونوں کے دلوں پر حضرتِ عشق کا قبضہ ہو گیا۔

ابن علقمہ جب اپنا کام کر چکا تو ناچار دونوں صبر کی سل رکھ کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے مگر دل کی خلش لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہو رہی تھی اور بے چینی و اضطراب میں ترقی۔

عشق و محبت کے تاثرات کا چھپانا محال ہی نہیں ناممکن ہے آخر ابن علقمہ کی وارفتگی کے بھی چرچے ہونے لگے۔ لوگوں نے ابن علقمہ کی ماں سے شکایت کی کہ تمہارا لڑکا ایک دوسرے قبیلہ کی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ خود اپنے قبیلہ میں اُس سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں موجود ہیں تم قبیلہ کی چند خوبصورت لڑکیاں اس کا دل بہلانے کے لئے اس کے پاس بھیجو۔ ممکن ہے کہ اس طرح دوسرے قبیلہ کی لڑکی کے خیال سے باز آکر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ مانوس ہو جائے۔ ابن علقمہ کی ماں نے ایسا ہی کیا قبیلہ کی چند منتخب و حسین لڑکیاں

اس کی صحبت میں بھیجیں +

کچھ عرصے کے بعد نوجوان سے پوچھا گیا کہ "ان نوجوان عورتوں کی نسبت تم نے کیا رائے قائم کی؟" "یوں تو اُن میں سے ہر ایک حسن وجمال میں یکتا ہے" لیکن تمہارے نزدیک [redacted] کو حاصل ہے۔ اپنے قبیلہ کی لڑکیوں کو یا جبیشہ کو" نوجوان نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "کیا کوئی پانی "صدا[51]" کے چشمہ کی طرح شیریں اور کوئی گھاس "سعدان[52]" کے برابر پسندیدہ ہو سکتی ہے؟" +

ابن علقمہ کی ماں نے ان چارہ سازیوں کے باوجود جب اپنے بیٹے کو جبیشہ کے فراق میں زیادہ مضطرب دیکھا تو مجبور ہو کر وہ علاج سوچا جو ایک غم نصیب شخص کے لئے باعثِ تسکین ہو سکتا ہے، وہ بنی جذیمہ کے قبیلہ میں جبیشہ کے گھر جاتی اور اپنی معیت میں ابن علقمہ کو بھی لے جاتی اور اس بہانہ سے دو ہجران نصیبوں کو وصال نصیب ہوتا +

اس زمانہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کی طرف (جو ابھی غیر مسلمان تھے) دعوت اسلام کی غرض سے وفد روانہ فرما رہے تھے حضور نے "بنی جذیمہ" کی طرف بھی حضرت خالد بن ولید سیف اللہ کی صدارت میں اسی قسم کا ایک وفد روانہ کیا قبیلہ بنی جذیمہ کے پاس سے کوچ کرتے

---

[51] صدا عرب میں ایک شیریں چشمہ ہے جس کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ اس سے بہتر عرب میں شیریں پانی نہیں (منتہی الادب)

[52] سعدان عرب میں سب گھاسوں سے اچھی سمجھی جاتی ہے کیونکہ اونٹ کو سب گھاسوں سے یہ زیادہ مرغوب ہے (ایضاً منتہی الادب) +

حسنِ اتفاق

(روس کے مایۂ ناز افسانہ نویس الگزینڈر پشکن کے ایک قصہ کا ترجمہ)

(از ابوالفاصل سید راز چاندپوری)

۱۸۱۱ء کے آخر کا ذکر ہے کہ نیک دل گارل اپنی جاگیر نزاڈا میں مقیم تھا۔ اس کی خلقی ہمدردی اور مہمان نوازی کی شہرت دُور تک پہنچ گئی تھی۔ گرد و نواح کے لوگ متواتر اس کے یہاں آنے اور اس کی دریا دلی و سیر چشمی کی بدولت لذت کام و زبان حاصل کرتے تھے۔ ان روزانہ آنے والے مہمانوں میں بعض تو محض کھانے پینے اور مزے اڑانے کے لیئے آتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے جن کی اصلی غرض گارل کی شریکِ زندگی پڑوِنا کے ساتھ تاش کھیلنا یا اُس کی نورِ نظر میریا کے حسن و جمال کے نظارہ سے اپنی آنکھوں کو پُرنور بنانا ہوتی تھی۔ میریا ایک حسین نازک اندام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوعمر دوشیزہ تھی۔ اس کے حسن جہاں افروز نے ایک زمانہ کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور ہر نوجوان کی یہ تمنا اور کوشش تھی کہ وہ اس کو اپنی رفیقِ حیات بنا کر عمر بھر کے لئے حقیقی مسرت کا مالک بن جائے +

روسی نژاد میریا کی تعلیم و تربیت فرانسیسی طریقہ پر ہوئی تھی۔ اور اس لئے "محبت" اس کی زندگی کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس کی نظر انتخاب نے ایک حسین نوجوان مگر غریب فوجی افسر کو اپنے لئے پسند کیا۔ جو کسی وجہ سے

اپنے عہدے سے مستعفی ہوکر آجکل خانہ نشین تھا۔ نوجوان نے بھی اس کی نگاہ محبت کو اپنے دل میں جگہ دی اور روزانہ ملاقاتوں نے بہت جلد ایک دوسرے کا گرویدہ بنا دیا لیکن میریا کے والدین نے اس کے اس انتخاب کو بنظر استحسان نہ دیکھا۔ اور اس کو نوجوان سے ملنے کی ممانعت کر دی۔ نوجوان کی اس ناکامیِ قسمت کا سبب صرف اس کا افلاس تھا*

اگرچہ اب ان وارفتگانِ محبت کو آزادی کے ساتھ ملنے اور ہمکلام ہونے کا موقع نہ ملتا تھا۔ مگر وہ اپنے اپنے دردِ دل کا اظہار بذریعہ تحریر کرتے رہتے۔ اور قریب روزانہ صنوبر کے جنگل کے کسی گوشہ میں یا قدیم معبد کے کھنڈروں میں چند لمحوں کے لئے ایک جگہ جمع ہوکر شوق دیدار پورا کر لیتے تھے۔ یہاں پر وہ کبھی تو ایک دائمی اور ابدی محبت کا عہدو پیمان کرتے، کبھی اپنی قسمت کا رونا روتے اور کبھی حصول مقصد کے لئے نئی نئی تدابیر سوچتے۔ آخرکار ایک مدت کی گفت و شنید اور خط و کتابت کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ:۔

اگر ہم ایک دوسرے کے بغیر خوش نہیں رہ سکتے اور بے رحم والدین ہمیں اپنی چند روزہ زندگی کو خوشگوار بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔ تو ہم کیوں ان سے کنارہ کش نہ ہو جائیں؟"

یہ خیال سب سے پہلے نوجوان کے دل میں پیدا ہوا۔ اور میریا نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا*

موسم سرما کے آتے ہی ان کی پوشیدہ ملاقاتیں یک قلم موقوف ہو گئیں مگر سلسلۂ خط و کتابت پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ ولیڈیمیر نے ہر ایک محبت نامے میں میریا کو ترغیب دی کہ وہ اس کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں

کوشش کرے یعنی وہ دونو خفیہ طریقہ پر شادی کر لیں۔ اور کچھ عرصہ کے لئے کہیں چلے جائیں۔ پھر کسی مناسب موقع پر واپس آئیں اور اعتراف قصور کے ساتھ اپنے والدین کے قدموں پر سر رکھ کر معافی کے خواستگار ہوں۔ یقین ہے کہ وہ ان کی وفاداری اور محبّت کی مجبوریوں پر نظر کر کے ان کی خطا سے درگزر کرینگے۔ اور دوبارہ اپنی آغوش محبّت میں جگہ دیں گے +

میریا عرصہ تک پس و پیش کرتی رہی، اور ولیٹ بمبیر نے فرار ہونے کی جس قدر تدابیر پیش کیں اُس نے سب مسترد کر دیں لیکن آخر کار جذبۂ محبّت کی کشش رنگ لائی اور وہ رضامند ہو گئی +

مقررہ تاریخ جس قدر نزدیک ہوتی ہو گئی، میریا کی پریشانی اسی قدر بڑھتی گئی۔ اور ایک روز پہلے سے تو وہ بالکل افسردہ و مضمحل نظر آنے لگی اس نے دن بھر مطلقاً کھانا نہیں کھایا۔ اور سرِ شام ہی سے دردِ سر کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اپنی ریشمی پوشاکیں اور دوسری ضروری اشیاء ایک جگہ جمع کیں اور لکھنے کی میز پر جا بیٹھی۔ اُس نے ایک طویل و پُر درد خط اپنی ایک سہیلی کو اور ایک مختصر خط اپنے والدین کو لکھا جس میں اُس نے نہایت درد انگیز الفاظ اور غم آموز لہجہ میں اُن سے جدا ہونے کی اجازت طلب کی۔ اور ان کو یقین دلایا کہ وہ محبت کے ہاتھوں مجبوراً گھر بار چھوڑتی ہے۔ آخر میں اُس نے تمنا ولی ظاہر کی کہ اگر اس کو کبھی قدمبوسی حاصل کرنے کی اجازت دی گئی تو وہ دن اس کے لئے بڑی خوش نصیبی کا دن ہوگا +

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی اور میریا بھی کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ آخر دونوں خطوط سربمہر کرنے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اور

اُس پر ایک غنودگی کا عالم چھا گیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ متواتر خوفناک خواب دیکھ دیکھ کر چونک اُٹھتی تھی۔ سب سے پہلے اس نے دیکھا۔ کہ جس وقت وہ گھر سے نکلکر اُس گاڑی میں بیٹھنے کے لیئے جا رہی تھی۔ جو اُس کے انتظار میں باغ کے اُس طرف کھڑی ہوئی تھی۔ تو یکا یک اُس کا باپ آ گیا اور اُس کو بر ہنہ پر گھسیٹتا ہوا دور تک لے گیا۔ اور آخر کار ایک عمیق غار میں ڈال دیا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ ولیٹڈ یمیر فرش سبزہ پر زخمی پڑا ہوا کراہ رہا ہے۔ اور آخری وقت بھی اسی کی یاد میں محو ہے۔ ان کے علاوہ اور طرح طرح کے وسوسے اور خطرے اس کو پیش آتے رہتے۔ اور وہ رات بھر اطمینان کی نیند نہ سو سکی +

صبح کو جب وہ اپنے کمرہ سے باہر آئی تو اس کا چہرہ بالکل زعفرانی تھا اور درد کی وجہ سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اُس کے والدین اس کی اس حالت کو دیکھ دیکھ کر پریشان تھے۔ اور بار بار اس کی طبیعت کا حال دریافت کرتے تھے۔ ماں باپ کے اس محبت آمیز برتاؤ سے میریا کے دل پر ایک چوٹ لگتی تھی۔ اور اس سے متاثر ہو کر اُس نے کئی بار فرار ہونے کا قصد ملتوی کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ولیٹڈیمیر کی خیالی تصویر اُس کے سامنے آموجود ہوئی۔ اور اس کا ارادہ پھر بدل گیا۔ الغرض اسی کشمکش میں دن تمام ہو گیا +

رات کے کھانے کا وقت آیا۔ دسترخوان چُنا گیا۔ مگر میریا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ اور والدین سے اجازت چاہی۔ انہوں نے حسب معمول اس کی پیشانی پر بوسہ دیکر دعائیں دیں۔ میریا کا دل بھر آیا۔ اور وہ بمشکل تمام ضبط گریہ کر سکی۔ اور منہ پھیر کر فوراً کمرہ سے نکل گئی +

خوابگاہ میں پہنچکر میبریا ایک کرسی پر جا گری، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے سے اس کا دل کچھ ہلکا ہوا۔ اور کچھ اپنی رازدار خادمہ کی تسلی و تشفی سے ہمت بندھی اور خاموش ہوکر مقررہ وقت کا انتظار کرنے لگی۔

یکایک آسمان پر ابر نمودار ہُوا۔ ہوا تیز ہوگئی۔ اور برف گرنے لگی۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے کواڑ اور پردے کھڑکھڑانے اور ہلنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمرہ کی ہر شئے اُس کی مفارقت سے بیقرار ہے۔ مکان میں بہت جلد خاموشی چھا گئی۔ اور ہر متنفس بے خبر سو گیا میبریا نے اپنے نازک جسم کو ایک گرم لبادہ میں چھپایا۔ خادمہ نے اسباب اٹھایا۔ اور دونوں صحن باغ میں پہنچ گئیں۔ برف کا طوفان ہنوز زور پر تھا۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے ان دونوں کو تھپیڑے دے دیکر پیچھے کی طرف دھکیل رہے تھے۔ گویا وہ ان نوعمر ناتجربہ کار گنہگاروں کو فرار ہونے سے باز رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ باغ کے اُس طرف سڑک پر ایک گاڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ گھوڑے سردی کی وجہ سے بیقرار ہو رہے تھے۔ اور ولیڈ بیبر کا کوچبان ان کو خاموش رکھنے کی غرض سے ان کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ گاڑی کے نزدیک پہنچکر میبریا نے اپنے مکان اور باغ پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور خدا کا نام لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور گھوڑے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہو گئے +

ولیڈ بیبر دن بھر ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ علی الصبح وہ جڈر ینو کے پادری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بمشکل تمام اس کو نکاح خوانی کے لئے رضامند کیا۔ اس کے بعد وہ گواہوں کی تلاش میں روانہ ہوا۔ یہ

سے پہلے وہ ایک ریٹائرڈ رسالدار سے ملا۔ جو اس کا شناسا تھا۔ رسالدار نے اس کی درخواست کو بخوشی قبول کر لیا۔ اور ولیڈ بیبہ کی سرگذشت سن کر اس کو اپنا عہد شباب یاد آگیا۔ اُس نے ولیڈی میر کے ساتھ ہمدردی اور عزت کا برتاؤ کیا۔ اور دو اور گواہوں کے مہیا کرنے کا بار اپنے سر لے لیا۔ دو پہر سے قبل مسٹر ونسر اور پولیس کپتان کا نوعمر حسین لڑکا الہن وہاں آئے۔ انہوں نے ولیڈ بیبر کی تجویز کو بنظر استحسان دیکھا۔ اور اس سے وعدہ کیا۔ کہ اگر ضرورت ہوئی تو وہ دونوں اس کے لئے جانیں قربان کر دینگے۔ ولیڈ بیبر نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور دوسرے انتظامات کی تکمیل کے لئے اپنے گھر کی طرف واپس ہوا ؛

شام ہو چکی تھی۔ اور ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ولیڈ بیر نے اپنے وفادار کوچبان کو تمام نشیب و فراز اور ضروری باتیں سمجھا کر حکم دیا کہ فوراً گاڑی لے کر نندا ڈا چلا جائے اور اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرے بعد ازاں وہ خود گھوڑے پر سوار ہو کر جیڈرینو کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں دو گھنٹہ کے بعد بیریا کے ساتھ اس کا عقد ہونے والا تھا ؛

ولیڈ بیر ابھی گھر سے نکلا ہی تھا کہ برف کا طوفان آگیا۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی۔ اور ایک لمحہ میں سڑک برف کی اور دوسری ارد گرد کی چیزیں کہرے کی چادر میں چھپ گئیں۔ ولیڈی میر راستہ سے بھٹک گیا۔ اس کا گھوڑا بے قاعدگی کے ساتھ آگے بڑھنے اور قدم قدم پر برف کے تودوں سے ٹھوکریں کھانے لگا۔ اس نے راستہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ آدھ گھنٹہ سے زیادہ گزر گیا۔ مگر جیڈرینو ضلع نظر نہ آیا۔ حالانکہ اس کے مکان سے جیڈرینو تک صرف بیس منٹ

کار استہ تھا۔ دس منٹ اور گذر گئے لیکن منزل مقصود کا اب بھی پتہ نہ چلا آخر کار اس کو معلوم ہُوا کہ وہ غلط راستہ پر جا رہا ہے۔ اس نے گھوڑے کو آگے چلنے سے روکا اور صحیح راستہ دریافت کرنے کی فکر کرنے لگا۔ مگر کہر آلود فضا میں اس کو کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے دل نے اس کو داہنی طرف لے جانے کی ہدایت کی۔ اور وہ اپنے ضمیر کی رہنمائی میں داہنی طرف روانہ ہُوا۔ مگر وہ جس قدر آگے بڑھتا گیا۔ جڈ رینو اسی قدر دُور ہوتا گیا۔ اور اس کے دل پر رنج و یاس نے قبضہ کرنا شروع کیا۔

مگر وہ برابر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور آخر ایک گھنے جنگل کے نزدیک پہنچ گیا۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا اور جنگل کے کنارے کنارے گھوڑا ڈال لیا۔ کیونکہ جڈ رینو جنگل کے اُس کنارے پر واقع تھا۔ ولیڈ بمیر کے خوف و پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اُس کو معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک غیر معروف جنگل میں سفر کر رہا ہے۔ اُس کا دل بیٹھ گیا۔ دماغ پریشان ہوگیا۔ لیکن اُس نے ہمت مردانہ سے کام لے کر گھوڑے کو مہمیز کیا۔ اور غریب جانور باوجود تھک جانے کے راکب کے اشارہ پر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ مگر جب ولیڈ بمیر اُس کی آخری حد پر پہنچا تو اُس نے اپنے آپ کو برف سے ڈھکے ہوئے ایک وسیع میدان میں پایا۔ اس کے دل سے بے اختیار آہ نکلی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ پھر کمر ہمت باندھ کر روانہ ہوا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ طوفان کا زور کم ہوگیا تھا۔ اور آسمان پر کہیں کہیں کوئی تارا نکل آیا تھا۔ اب ولیڈ بمیر اردگرد کی چیزوں کو دیکھ سکتا تھا۔ کچھ فاصلہ پر اس کو ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا اور وہ بیتابانہ اس کی طرف لپکا۔ پہلے ہی مکان کے نزدیک پہنچکر وہ گھوڑے

سے اترا اور دیوانہ وار دروازہ پر دستک دینی شروع کی۔ چند لمحوں کے بعد بالائی منزل کی کھڑکی کھلی اور ایک ضعیف العمر شخص نے سر نکال کر پوچھا۔

ضعیف تم کیا چاہتے ہو؟

ولیڈبییر۔ جڈر بنو یہاں سے کتنی دُور ہے؟ کیا بہت دور ہے؟

ضعیف۔ جی نہیں کچھ زیادہ دور نہیں، صرف دس میل۔

یہ جواب سُنکر ولیڈبییر کی جان نکل گئی۔ وہ بالکل ساکت وصامت کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اور جب ذرا ہوش وحواس درست ہوئے تو کہنے لگا۔

ولیڈبییر۔ مہربانِ من میرا گھوڑا بہت تھک گیا ہے۔ اور مجھے صبح ہونے سے پہلے جڈر بنو پہنچنا ضروری ہے۔ کیا تم میرے لئے ایک گھوڑے کا انتظام کر سکتے ہو؟

ضعیف۔ افسوس! ہم غریبوں کے یہاں گھوڑے جیسی بیش قیمت چیز کہاں ہو سکتی ہے۔

ولیڈبییر۔ تو کیا ایک رہنما مل سکتا ہے؟

ضعیف۔ ہاں یہ ممکن ہے، ٹھہرو مَیں اپنے لڑکے کو بھیجتا ہوں۔ جو تم کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیگا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھُلا۔ ایک نوجوان ہاتھ میں ڈنڈا لئے ہوئے برآمد ہوُا اور ولیڈبییر کے آگے آگے چلنے لگا۔

سپیدۂ سحر کی روشنی میں، سحر خیز پرندوں کے چہچہوں کے ساتھ ولیڈبییر جڈر بنو پہنچا۔ رہنما کو اس کا حق الخدمت ادا کر کے رُخصت کیا۔ اور خود گرجے کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح ہوئی گارل اور اُس کی رفیق زندگی پیٹرونا خوابگاہ سے برآمد ہوئے اور نشستگاہ میں بیٹھ کر چائے کے تیار ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ گارل نے ایک ملازم کو میریا کے پاس اس کی خیریت دریافت کرنے کو بھیجا۔ جس کے جواب میں خود میریا حاضر ہوئی۔ اور والدین کو سلام کیا +

گارل۔ کہو میریا! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے ؟

میریا۔ ابّا جان! اچھی ہوں۔

پیٹرونا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کل تم آتشدان کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھی رہیں اور کوئلے کے دھوئیں کے اثر سے تمہاری طبیعت خراب ہو گئی۔

میریا۔ غالباً ایسا ہی ہے۔

دن تو حسب معمول ہنسی خوشی گزر گیا۔ مگر رات میں میریا کی طبیعت یکا یک خراب ہو گئی۔ اور وہ دو ہفتہ تک بستر علالت پر پڑی رہی۔ گزشتہ شب کے واقعات کا علم گھر کے لوگوں میں سے کسی کو نہ تھا۔ میریا نے وہ دونوں خطوط جلا ڈالے تھے۔ خادمہ نے میریا کی ناراضی اور بدنامی کے خیال سے کسی سے کچھ ذکر نہیں کیا تھا۔ پادری، رسالدار اور دوسرے واقف حال لوگ مصلحتاً خاموش تھے۔ الغرض اس راز سے بجز راز داروں کے اور کوئی واقف نہ تھا لیکن اسی دوران میں ایک روز حالت بیہوشی میں میریا نے اس راز کو خود ہی طشت از بام کر دیا۔ اور من و عن پورا افسانہ کہہ سُنایا۔ مگر اُس کی گفتگو ایسی غیر مربوط اور مہمل تھی۔ کہ اس کی ماں بھی، جو ہر وقت اس کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ صرف اس قدر سمجھ سکی کہ اس کو ولیڈیمیر سے بے حد محبت ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ بیمار پڑ گئی ہے۔ اُس نے اپنے شوہر و نیز ہمسایوں سے مشورہ کیا۔ اور آخر کار متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ جب کہ

فطرتاً ایک عورت ایک شخص سے عہد محبت باندھنے کے بعد اُس سے جدا نہیں ہو سکتی تو میریا کو جس کے دل میں ولیڈ بیبر کی محبت جاگزین ہو چکی ہے کیوں اس کے جائز حق سے محروم رکھا جائے؟ علاوہ ازیں اصول اخلاق کی رُو سے مفلس ہونا کوئی ایسا جرم نہیں ہے۔ جس کی تلافی ناممکن ہو کیونکہ عورت کی شادی مرد کے ساتھ ہوتی ہے نہ کہ دولت کے۔

میریا کی حالت اب رو بصحت تھی۔ ولیڈ بیبر نے ایک مدت سے میریا کے گھر آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ اس طوفانی رات کے خوفناک اور حیرت انگیز واقعات نے اس کو ایک پیکر یاس و غم بنا دیا تھا۔ اور وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو چکا تھا۔ میریا کے عزیزوں نے باہم مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ولیڈ بیبر کو اس کی رسائی قسمت یعنی میریا کے والدین کی رضامندی کی اطلاع دیدی جائے۔ اطلاع دی گئی۔ لیکن جواب بالکل خلاف امید ملا جس کو سن کر ہر شخص متحیّر رہ گیا۔ اور لوگوں نے سمجھا کہ شاید اپنے افلاس اور میریا کی مفارقت کے صدمات پیہم سے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خط کا مطلب صرف اس قدر تھا:۔

"میری برگشتہ قسمت نے مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ اپنی صورت آپ لوگوں کو دکھاؤں۔ خدا کے لئے میرے حالِ زار پر رحم کرو۔ اور ایک ایسی بدنصیب ہستی کو جس کی زندگی صرف موت پر منحصر ہے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ"۔

چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ ولیڈ بیبر اپنا نام دوبارہ فوج میں لکھا کر کہیں چلا گیا۔

ایک مدت تک میریا کو اس واقعہ کی اطلاع نہیں دی گئی۔ اب وہ

بالکل تندرست ہوگئی تھی۔ چند ماہ گزر گئے اور ولیڈ بیبر کا نام کبھی بھولے سے بھی میریا کی زبان پر نہ آیا لیکن ایک روز جب اس نے ولیڈ بیبر کا نام ان لوگوں کی فہرست میں دیکھا۔ جنہوں نے بارو ڈینو کے میدان جنگ میں (جو روسیوں اور فرانسیسیوں کے درمیان واقع ہوا تھا) کارہائے نمایاں انجام دئے تھے۔ اور جو زخمی ہو کر ماسکو کے شفاخانہ میں داخل ہوئے تھے۔ تو وہ یکایک غش کھا کر گر پڑی۔ اور لوگوں کو یہ خوف ہوا کہ شاید وہ دوبارہ بیمار ہو جائیگی۔ مگر خدا کا شکر ہے۔ کہ اس کو جلد ہوش آگیا۔

اسی عرصہ میں گارل کا انتقال ہوگیا۔ اور میریا اس کی تمام جائداد کی تنہا مالک بن گئی۔ کیونکہ گارل کے اور کوئی اولاد نہ تھی۔ لیکن اس جائداد اور دولت کے حاصل ہونے سے اس کی دلی افسردگی بجائے کم ہونے کے اور بڑھ گئی۔ اور اس کا دل ایسا گھبرایا کہ وہ فوراً نندراڈا کی سکونت ترک کر کے اپنی ماں کے ہمراہ ایک دوسرے موضع میں چلی گئی۔

نندراڈا کی طرح یہاں بھی اس کے خواستگاروں کی کافی تعداد پیدا ہوگئی تھی۔ اول تو میریا کا حسن و جمال خود ہی قیامت خیز تھا۔ دوئم وہ ایک بڑی جائداد اور دولت کی مالک تھی اس لئے ہر شخص کی یہی آرزو اور کوشش تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے میریا کے دل میں اپنی جگہ پیدا کر لے۔ مگر فریب خوردۂ محبت میریا نے کسی کو کوئی امید نہیں دلائی۔ اکثر اس کی ماں نے اس کو ترغیب دی کہ وہ ان نوجوانوں میں سے، جو صبح و شام اس کے گرد جمع رہتے ہیں اور شمع حسن پر پروانہ وار نثار ہونے کو آمادہ ہیں کسی ایک کو اپنے لئے انتخاب کر لے۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوئی

بلکہ جب کبھی پیٹرونا اس قسم کی گفتگو کرتی تو میربا اور زیادہ افسردہ اور دل گرفتہ ہو جاتی۔ ولیڈیمیر اب اس دُنیا میں موجود نہ تھا۔ اور میربا کو اس کی وفات کا علم ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کے دل میں نامراد مرنے والے کی یاد تازہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے ولیڈیمیر کی لائی ہوئی کتابیں، قطعات، طغرے اور اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشعار، غرض اس قسم کی بہت سی چیزیں باحتیاط اپنے کمرہ میں رکھ چھوڑی تھیں۔ اور اکثر عالمِ تنہائی میں کسی نہ کسی یادگار کے مطالعہ یا نظارہ میں محو رہتی تھی۔ میربا کے عزیز اور ہمسایہ زن و مرد اس کی اس خود رفتگی اور وفاداری پر متعجب تھے۔ اور بے صبری کے ساتھ اس خوش نصیب جوانمرد کو دیکھنے کے منتظر تھے۔ جو اس کی ثابت قدمی کو شکست دے سکے ؞

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ میربا کی بے اعتنائی اور سرد مہری کے باوجود اس کے خواستگاروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ مگر جس وقت کرنیل بورمن اس کے جان بازوں کے حلقہ میں داخل ہوا تو دوسرے تمام دعویداران محبت کو ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانا پڑا۔ بورمن کی عمر تقریباً چھبیس سال تھی۔ وہ ایک خوشرو نوجوان تھا۔ پہلے ہی دن اس کو دیکھ کر میربا کے دل میں خود بخود ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ اس سے محبت کرنے لگی۔ اب اس کی وہ اگلی افسردگی اور بے حسی یکسر موقوف ہو گئی تھی۔ اور اگرچہ وہ اس سے بہت ہی بے تعلق اور بیگانہ بنی رہتی تھی۔ لیکن اہل نظر کی نگاہوں سے اس کی دزدیدہ محبت آمیز نظریں کس طرح پوشیدہ رہ سکتی تھیں ؞

بورمن دراصل حسین تھا۔ اس کے عادات و اطوار دلا ویز اور پسندیدہ تھے میرپا کے ساتھ اس کا برتاؤ بالکل سادہ اور راستبازانہ تھا جس میں خود نمائی اور ریا کا شائبہ نہ تھا۔ وہ بظاہر حیا دار، پاک باطن اور خاموش معلوم ہوتا تھا لیکن ان تمام اوصاف میں سے جس صفت نے میرپا کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ وہ محض اس کی خاموشی تھی۔ وہ ہمیشہ ساکت و صامت رہنے کا عادی تھا اور حسب ضرورت بہت ہی آہستگی اور نرمی سے مختصر گفتگو کرتا تھا۔ الغرض اب میرپا کو بورمن کے ساتھ ایک تعلق خاطر پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں راحت قلب محسوس کرنے لگی تھی۔ اور غالباً بورمن کو بھی اس کیفیت قلبی کا احساس تھا لیکن ہنوز بورمن کی زبان سے اظہار محبت نہ ہوا تھا۔ اور اس لئے میرپا کو ایک گونہ تعجب اور تردد تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی کبھی اس کو بزدل سمجھتی کبھی مغرور یا مکار خیال کرتی۔ مگر اس کی خاموشی کا راز ظاہر نہ ہوتا۔ بہت کچھ غور و خوض کے بعد آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ بورمن کو اس کے ساتھ انتہائی محبت ہے لیکن اس کی قلبی کمزوری اس کو اظہار محبت کی اجازت نہیں دیتی۔ اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لینے کے بعد میرپا نے بورمن کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی میں طرح طرح سے کوشش کرنی شروع کی۔ اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی ✦

ایک دن شام کے وقت پٹرونا برآمدہ میں تنہا بیٹھی ہوئی تاش سے دل بہلا رہی تھی۔ کہ بورمن بے تابانہ در آیا۔ اور آتے ہی میرپا کو پوچھا۔ اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ باغ میں ہے۔ بلا انتظار و اجازت باغ کیطرف چلا گیا۔ تجربہ کار سن رسیدہ پٹرونا بورمن کی حالت دیکھ کر سمجھ گئی کہ

میریا کی محبت کا جادو کارگر ہو چکا ہے۔ اور اس خیال سے اس کو روحانی مسرت حاصل ہوئی۔ کہ آخر ایک مدت کے بعد میریا کو اس کے حسب منشا شوہر مل گیا ✤

میریا لب حوض ایک بید کے درخت کے سایہ میں کھڑی ہوئی تھی اُس کے ہاتھ میں کتاب تھی اور نگاہ سطح آب پر۔ وہ کسی گہرے خیال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بورمن کے قدموں کی آہٹ سُن کر وہ یکایک چونک پڑی۔ اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ پہلے دونوں کی نگاہیں ملیں پھر ہاتھ اور مزاج پُرسی کے بعد۔ دونو خاموش ہو گئے ✤

بورمن اس موقعہ کو اظہار مقصد کے لئے مناسب سمجھ کر میریا کی طرف مخاطب ہوا اور سراپا آرزو بن کر کہنے لگا "کیا تم کو معلوم ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے؟ اور کس قدر محبت ہے؟"

محبت کا نام سن کر میریا کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے مسکرا کر شرم آلود نگاہیں نیچی کر لیں۔ اور گردن جھکا لی۔ چند لمحے تک بورمن دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کے سراپا کو دیکھتا رہا۔ اور پھر یکایک چونک کر کہنے لگا۔

بورمن۔ میریا! مجھے اپنی غلطی کا اب احساس ہوا ہے جبکہ میں تجھ سے روزانہ ملنے اور ہمکلام ہونے کا عادی بن گیا ہوں۔ تمہارا خیال ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ اور تمہارے بغیر دنیا میں میرا زندہ رہنا دشوار ہے۔ میں نہیں جانتا میرا انجام کیا ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ میرے ضمیر کا تقاضا ہے کہ میں تم کو اس خوفناک راز سے آگاہ کروں۔ جس کے معلوم ہونے پر ممکن ہے۔ کہ ہمارے تعلقات خوشگوار نہ رہیں۔ اور ہمارے درمیان ایک حد فاصل قائم ہو جائے ✤

میریا۔ وہ حد فاصل تو پہلے ہی موجود ہے۔ اور میں جانتی ہوں کہ تم میرے رنج و راحت کے شریک نہیں ہو سکتے۔

بورمن۔ ہاں مجھے معلوم ہے کہ فریب خوردہ محبت ہو۔ لیکن اب جبکہ وہ ہستی جو تمہاری محبت کا مرکز تھی۔ دنیا میں موجود نہیں ہے اور تین سال تک تم اس کا سوگ منا چکی ہو۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ تم میری حالت زار پر رحم کرو اور مجھے مایوس نہ بناؤ +

میریا۔ بس بس خاموش ہو جاؤ خدا کے لئے ــــ کیوں میرے زخم جگر پر نمک پاشی کرتے ہو +

بورمن خیر، مجھے اب بھی کہ تم ضرور میری ہو جاتیں مگر آہ! دنیا میں مجھ جیسا نامراد بھی شاید کوئی نہ ہوگا۔ افسوس! میری شادی ہو گئی ہے +

میریا۔ ایں! تمہاری شادی ہو گئی ہے۔

بورمن۔ تقریباً چار سال گذرے کہ اتفاقیہ میری شادی ایک اجنبی لڑکی سے ہوئی تھی۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ اب وہ کہاں ہے۔ اور نہ اس سے ملنے کی کوئی امید ہے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ ہماری شادی کس جگہ ہوئی تھی +

میریا۔ تعجب ہے۔ اچھا پورا واقعہ بیان کرو۔ تو کچھ پتہ چلے +

بورمن۔ ۱۸۱۲ء کے شروع میں میں دلنا جا رہا تھا۔ جہاں میری رجمنٹ متعیم تھی۔ ایک دن شام کو میں نے ایک جگہ قیام کیا لیکن مجھے جلد از جلد دلنا پہنچنا تھا۔ اس لئے تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں نے روانگی کا قصد کیا۔ مگر فوراً ہی ایک خوفناک برف کا طوفان آگیا۔ اور مجھے مجبوراً ٹھہرنا پڑا۔ لیکن جتنی دیر میں وہاں مقیم رہا۔ مجھے برابر محسوس ہوتا رہا کہ کوئی شخص

مجھے آگے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ میرا دل خود بخود بیقرار تھا اور ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹہ سے زیادہ گزر رہا تھا۔ آخر میں نے اپنا گھوڑا منگایا۔ اور سوار ہو کر اسی طوفان میں چل دیا۔ میں نے دریا کے کنارے سفر کرنا شروع کیا۔ کیونکہ عام راستہ کی بہ نسبت اس راستہ سے سفر میں چند میل کی کمی ہو جاتی تھی۔ راستہ بالکل برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور مطلع ابر آلود تھا۔ میں راستہ بھول کر ایک نامعلوم مقام پر پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں کے اندر داخل ہونے کی جو راہ تھی اس پر سب سے پہلے ایک گرجا واقع تھا۔ جس کا دروازہ کافی رات گزر جانے کے باوجود اس وقت کھلا ہوا تھا۔ اور دھیمی دھیمی روشنی کھڑکیوں اور روشندانوں سے باہر آرہی تھی۔ اور صحن میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ چونکہ اس طوفانی رات میں اس وقت گرجے کا کھلنا غیر معمولی بات تھی۔ اس لئے میرے دل میں فطرتاً واقعات معلوم کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور میں گرجے کے احاطہ میں داخل ہو گیا۔

احاطہ کے اندر قدم رکھتے ہی "ادھر آؤ، ادھر آؤ" کی آوازیں آنے لگیں۔ اور جب میں گرجے کے دروازہ پر پہنچا تو کسی شخص نے کہا "خدا کی پناہ! تم نے اس قدر دیر کہاں لگائی؟ تمہارا انتظار کرتے کرتے غریب دلہن بے ہوش ہو گئی۔ اور وہ اس وقت بالکل بے ہوش ہے"۔

میں اپنے دل میں نہایت حیران ہوا۔ مگر بغیر کچھ کہے سنے گھوڑے سے اتر کر گرجے کے اندر داخل ہو گیا۔ ہال میں دو تین شمعیں روشن تھیں۔ جن کی دھندلی روشنی میں کسی شخص کا چہرہ صاف نظر نہ آتا تھا۔ ایک طرف ایک نوعمر لڑکی بنچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور ایک دوسری لڑکی اس کے پاس بیٹھی ہوئی

اس کا سر دبا رہی تھی۔ اس لڑکی نے مجھے دیکھ کر کہا "خدا کا شکر ہے۔ کہ تم آ گئے۔ تم نے اتنی دیر لگائی کہ ہماری ملکہ پریشان ہو گئی"۔

پھر پادری نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "اچھا اب آپ جلد اجازت دیجئے۔ تاکہ میں شروع کر دوں"۔

مَیں نے سر کے اشارے سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ اور نوعمر لڑکی اپنی سہیلی کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ اگرچہ میں اس کا چہرہ صاف طور پر نہیں دیکھ سکا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے لڑکی حسین اور محبت کئے جانے کے قابل تھی۔ پادری نے خطبہ نکاح پڑھا۔ اور ہمارا عقد ہو گیا۔ حاضرین نے ہم دونوں کو مبارکباد دی۔ اور ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ حسین لڑکی نے اپنا زرد چہرہ میری طرف کر دیا۔ اور جیسے ہی میں آگے کو بڑھا۔ حسین لڑکی نے اپنا زرد چہرہ میری طرف کر دیا۔ اور جیسے ہی میں نے ہاتھ پھیلائے۔ اور اس کی طرف جھکا۔ وہ خوفزدہ ہو کر چلا اُٹھی "او ہو! دھوکا۔ دھوکا! یہ تو وہ شخص نہیں ہے۔ یہ تو وہ ——" اتنا کہکر وہ بیہوش ہو گئی۔ حاضرین حیرت زدہ ہو کر میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے وہاں ٹھہرنا خطرناک سمجھا اور فوراً گرجے سے باہر آ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور ایک طرف کو چل دیا۔

میریا۔ پناہ بخدا! لیکن پھر بھی تم کو یہ معلوم نہیں کہ وہ غریب لڑکی کہاں ہے؟

بورمن۔ مجھے کچھ بھی خبر نہیں۔ اُس زمانہ میں مجھے اس قسم کے معاملات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ تاہم ایک مدت تک یہ افسانہ میری اور میرے دوستوں کی دلبستگی اور تفریح طبع کا سبب بنا رہا۔ اس وقت تو میں اس کو محض ایک مذاق سمجھتا تھا۔ لیکن اب جب کبھی اس کا خیال آ جاتا ہے تو مجھے ایک قسم کا افسوس ہوتا ہے۔ اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔ کہ مَیں نے کیوں اس بیچاری

کی راہ ماری۔ اور کیوں اس معصوم پیکر حسن پر ایک ناقابل معافی ظلم کیا؟
میریا۔ اوہو! وہ تم ہو!! اگر تم اس مظلوم لڑکی کو نہیں پہچانتے جو اس وقت بھی ایک پیکر مظلومیت بنی ہوئی تمہارے سامنے موجود ہے +

یہ الفاظ سنکر تورمن حیرت زدہ ہوگیا اور فوراً اپنا سر میریا کے قدموں پر رکھدیا +

واقعہ یہ ہے کہ اس طوفانی رات میں ولیڈی میر تو راستہ بھول کر شب بھر ادھر اُدھر مارا مارا پھرا۔ مگر میریا اور دوسرے لوگ حسب وعدہ گرجے میں پہنچ گئے اور ولیڈ میر کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن وہ مقررہ وقت پر وہاں نہ پہنچ سکا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور میریا کے دل پر ولیڈ میر کی وعدہ خلافی اور بیوفائی کا ایسا اثر ہوا کہ وہ بیہوش ہوگئی۔ اور حاضرین پریشان۔ ٹھیک اسی وقت اتفاقیہ تورمن وہاں جا پہنچا۔ لوگوں نے اس کو ولیڈی میر سمجھا۔ اور میریا کے ساتھ اس کا عقد کر دیا گیا لیکن فریب کھل جانے پر تورمن وہاں سے چلتا بنا۔ اور میریا بادل نخواستہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔ صبح کو پادری کی زبانی ولیڈی میر کو رات کے واقعہ کا علم ہوا۔ اور وہ اپنی ناکامئی تقدیر پر اشک حسرت بہاتا اُلٹے پاؤں وہاں سے واپس ہوا۔ اور برداشتہ خاطر ہوکر دوبارہ اپنا نام فوج میں لکھا لیا۔ اور آخر بارو ڈینو کے معرکہ میں زخمی ہوکر ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہوگیا۔ لازماً میریا اس واقعہ کے بعد افسردہ و غمگین رہنے لگی۔ اور اُس نے دوبارہ شادی کرنیکے خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دی +

اب اسکو صرف حسن اتفاق کہا جا سکتا ہے کہ میریا کو تورمن کے ساتھ خود بخود محبت ہوگئی۔ اور حقیقت حال ظاہر ہونے کے بعد دونوں ایکدوسرے کے رفیق زندگی بن گئے +

(ہزارہ اسنان)

غلط فہمی

(از خان قدرت اللہ خان صاحب دیوانہ بریلوی)

یوں تو اس چھوٹے سے خس پوش۔ بوسیدہ جھونپڑے کی بساط ہی کیا تھی مگر اس کے آس پاس کے اونچے اونچے درختوں کی قطاروں۔ پہاڑی ناہموار زمین۔ سبز و شاداب گھاس اور دریائے کابل کی شفاف لہروں نے اس کو بڑی حد تک فریب اور دلکش بنا دیا تھا۔

نصیر خاں اپنی ڈور اور بنسی لئے۔ کرتا۔ شلوار پہنے۔ یہاں سے کچھ فاصلہ پر لب دریا خاموش بیٹھا شکار کھیل رہا تھا کہ دفعتہً فضائے آسمانی پر اودی اودی گھٹائیں چھا گئیں۔ بات کی بات میں گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو گیا اور طوفانی بارش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ نصیر خاں چونکہ ابھی ابھی سخت بیماری سے اٹھا تھا۔ اس کو سردی اور بارش سے محفوظ رہنے کی خاص ہدایت کی گئی تھی اور چونکہ اس وقت پوستین یا کوئی ایسی دوسری شے اس کے پاس نہ تھی جس سے اپنے جسم کو رطوبت سے بچا سکے اس لئے وہ گھبرا کر اٹھا اور ادھر ادھر جائے پناہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ کہ اس کی نظر اس جھونپڑے پر پڑی۔ وہ بے تحاشا بھاگ کر اس طرف آیا اور قبل اس کے کہ بارش کا پہلا قطرہ زمین پر گرے دروازہ کھول کر بے تکلف اندر داخل ہو گیا۔

اب وہ ایک وسیع اور خوشنما کمرہ میں تھا جس کا ساز و سامان دیکھ کر اس

کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ پختہ چمکدار فرش پر جا بجا مختلف جانوروں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ میز۔ کرسی وغیرہ ہر چند کہ بوسیدہ اور قدیم وضع کی تھیں۔ مگر پھر بھی قیمتی اور صناعی کا بہترین نمونہ۔ در و دیوار پر دو چار دستی تصاویر لٹکی ہوئی تھیں۔ انگیٹھی پر دو پیتل کے خوشنما گلدان اور کچھ شیشے چینی کے برتن رکھے تھے ایک طرف کھڑکی میں مصوری کے تختے پر ہوائی جہاز کی نامکمل تصویر چسپاں تھی جس کا دریائی معکوس اور گرداگرد کے نظر فریب مناظر۔ درختوں کا سین روانیٔ آب۔ بچوں کا حیرت و استعجاب سے اس کی طرف دیکھنا ایسی دلکش و دلفریب اور منظر آفرین باتیں تھیں جو نصیر خاں کی حساس طبیعت پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ کمرہ کا ساز و سامان بلکہ ہر شے کے حسن انتخاب اور اس کی آراستگی میں ایک نسائی ذوق اور خوش سلیقگی اس درجہ بین طور پر نمایاں تھی کہ نصیر خاں کو بار بار اپنے دل میں یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ اس کی مالک ضرور کوئی خاتون ہے جو فن مصوری کی شائق اور بہترین ماہرہ ہے ٭

نصیر خاں نے کھڑکی کے باہر نظر کی تو دیکھا کہ موسلا دھار پانی پڑ رہا تھا ہوا کے تیز تھپیڑوں سے درختوں پر ایک پر لطف اور وجدانی کیفیت طاری تھی، ندی نالے اُبلے پڑتے تھے۔ وہ اس فرحت بخش منظر کا لطف اٹھانے کے لئے کھڑکی کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ تو گیا لیکن دل ہی دل میں اس خیال سے شرمندہ اور پریشان تھا کہ مالکِ مکان اس کی دیدہ دلیری اور ناجائز دخل اندازی پر خدا معلوم دل میں کیا کیا نہ خیال کرے۔ اسی طرح اپنے خیالات کی اُدھیڑ بُن میں وہ کرسی سے اٹھا۔ ڈھونڈھ کر انگیٹھی میں کچھ کوئلے وغیرہ ڈالے اور دیا سلائی لگا کر پھر بیٹھ گیا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ دفعتہً جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ کسی نے باہر سے ایک

چھوٹا سا ہلکا اسٹول تصویر بنانے کا تختہ۔ رنگ کی تشتری اور کاغذوں کا بنڈل ایک ایک کرکے اندر پھینکے۔ اس کے بعد ایک دوشیزہ۔ عمدہ قسم کی برساتی اوڑھے بارش کے پانی سے از سرتا پا شرابور۔ ہانپتی۔ کانپتی داخل ہوئی جس کو دیکھتے ہی نصیر خاں کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کے قلب کی پر زور حرکت نے جسم میں رعشہ پیدا کر دیا۔ ایک طرف تو رُعب حُسن۔ اور دوسری جانب اپنی ناجائز موجودگی کی ندامت نے اس کو مجبور کیا کہ خود ہی سر نیاز جھکا کے اقرار جرم کرلے مگر اس اثنا میں لڑکی نے اس کو دیکھ لیا۔ اس کی متبسم نظروں اور سر کی ایک خوشگوار جنبش نے نہ صرف اس کے اطمینان قلب کا ثبوت دیا۔ بلکہ نصیر خاں کی تالیف قلب کا سبب بن گئیں۔ وہ جلد جلد اپنا سامان قرینے سے رکھنے لگی۔ انگیٹھی پر نظر پڑتے ہی اُس نے خندہ پیشانی سے پوچھا "کیا یہ آگ آپ نے سُلگائی ہے؟ .... ناحق زحمت فرمائی .... میں شکریہ ادا کرتی ہوں"۔

نصیر خاں کو اپنی قوت سماعت پر اعتبار نہ ہوا۔ اس کو حیرت تھی کہ بجائے سخت کلامی اور دشنام دہی کے وہ ان تشکر آمیز الفاظ کا کیونکر مستحق ہو گیا۔ جن معذرت کے الفاظ کا ذخیرہ لے کر وہ فرط ادب سے کھڑا ہوا۔ ان میں سے ایک بھی اس سے ادا نہ ہو سکا۔ اس نے گھبراہٹ میں فقط اتنا کہدیا:۔

"محض اس لئے کہ شاید آپ بھیگتی ہوئی آئیں اور آگ کی ضرورت ہو"۔

"جی نہیں! میں بھیگی نہیں ہوں۔ برساتی نے مجھے بہت کچھ بچا لیا"۔ یہ کہکر اُس نے برساتی اتار کر لٹکا دی۔ اور اپنے دوپٹے کا بھیگا ہوا آنچل آگ کے سامنے پھیلا کر قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور بولی "مجھے نہایت مسرت ہے کہ میری عدم موجودگی میں آپ بے تکلف یہاں تشریف لے آئے آپ"

کہ دنیا دیکھا ہے بے تعلق ہو کر دنوں کا شمار کس کو ٹھیک یاد رہ سکتا ہے اور بھلا پھر مجھ جیسی کمبخت یاد کو! مجھے آج برابر دوشنبہ کا خیال رہا۔ آپ کو آئے غالباً زیادہ دیر نہ گزری ہوگی۔ مجھے آپ نے اپنی تشریف آوری سے صد درجہ ممنون فرمایا..... منشی محمد اسمٰعیل خانصاحب! حقیقتاً آپ جیسے مشغول آدمی کا عزیز وقت اتنے دشوار گزار سفر میں بیکار صرف ہوا۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ مگر کیا کروں۔ مجبور تھی۔ ورنہ خود جلال آباد حاضر ہو جاتی........ آپ تشریف رکھیں۔ میں چائے تیار کرتی ہوں"+

نصیر خاں عالم تحیر و تشویش میں لڑکی کو بار بار سر سے پاؤں تک دیکھتا۔ اور ہر سوال کے جواب میں یا تو محض سر ہلا دینے پر اکتفا کرتا۔ یا کبھی عالم بیخودی میں اس کی زبان سے "ہاں" "نہیں" محض طور پر نکل جاتا۔ محمد اسمٰعیل خانصاحب کا نام سنتے ہی وہ ایک بار اچھل پڑا مگر یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ کوئی صاحب ہیں جن کی آمد کی لڑکی منتظر تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس نے ان کو کبھی دیکھا نہیں ہے۔ چنانچہ بار بار ارادہ کرنے کے باوجود اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اور وہ سراسیمہ اور پریشان اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔ مگر لڑکی پر اس کا اثر ہی دوسرا ہوا۔ وہ اس کی خاموشی اور کم سخنی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی اور سمجھی کہ ان وکیلوں کا فرقہ بھی عجب خاموش طبیعت اور استقلال پسند ہوتا ہے گھنٹوں چپ بیٹھ کر دوسروں کی داستان سنتے رہنا بس انہی کا کام ہے +

کچھ دیر بعد اس نے قصداً ازراہ تمسخر پوچھا "کیئے جلال آباد میں آج موسم کیسا تھا؟"

"موسم کے اعتبار سے خوشگوار" نصیر خاں نے بڑی احتیاط سے کام لیا

تاکہ اس کا ہر جواب مختصر اور مزید سوال کی گنجائش سے بے نیاز ہو۔ لڑکی کو اس پر بے ساختہ ہنسی آگئی اور بولی "سبحان اللہ! کس قدر قانونی اور نپا تلا جواب ہے۔ یہی تو وکیلوں کی خصوصیت ہے۔ کیا اس کے لئے بھی اسی قدر احتیاط کی ضرورت تھی؟"

یہ سنتے ہی نصیر خاں کے اور کان کھڑے ہو گئے۔ اس کو اب صاف ظاہر ہو گیا کہ محمد اسمٰعیل خانصاحب جن کا لڑکی نے ابھی نام لیا ہے کوئی جلال آباد کے وکیل ہیں! اور اس پر اُسے ان کا پورا شبہ ہو رہا ہے۔ وہ پریشان تھا کہ کس طرح اس مخمصہ سے نجات حاصل کرے۔ گو اس کو وکیل بننے اور اس کے نباہنے میں چنداں پس و پیش نہ تھا مگر صورتِ معاملات اس قدر پیچیدہ ہوتی جاتی تھی کہ اس کو اپنی ندامت اور شرمندگی کا وقت قریب تر نظر آتا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اب کی بار پوری ہمت کر کے ارادہ کر لیا کہ جس طرح ہو لڑکی کو مزید اظہارِ واقعات سے روک رہے مگر اسی اثنا میں لڑکی نے پھر کہنا شروع کر دیا:۔

میں جس قدر جلد آپ کو اپنے معاملات سے کما حقہ واقف کر دوں اسی قدر جلد آپ کسی مناسب نتیجہ پر پہنچنے پر کامیاب ہونگے۔ اور چاہے بھی نطیب خاطر نوش فرما سکیں گے۔ یہ تو میں آپ کو لکھ چکی ہوں کہ سارا معاملہ میرے حقیقی بھائی سے تعلق رکھتا ہے۔ میرے بھائی فریدالدین سے . . . . . .

نصیر خاں نے گھبراہٹ میں ایک ہاتھ بڑھا کر لڑکی کو خاموش کرنے کی کوشش کی اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا" اس کے متعلق آپ آپ کچھ اور نہ فرمائیں میں نہیں سمجھتا کہ آپ مجھ کو کیا خیال کریں گی جب میں . . . . .

لڑکی نے بات کاٹ کر) بیشک! آپ واقعات سے ناواقف ہیں۔ آپ

اس وجہ سے پریشان نہ ہوں مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی تحریر میں آپ کو مفصل حالات سے مطلع نہ کرسکی لیکن اب آپ کو مختصر الفاظ میں سارا قصہ سنائے دیتی ہوں جس کے بعد آپ کی صائب رائے سے مستفید ہونا میرا واحد مقصد ہوگا۔"

نصیر خاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بالآخر خاموش ہوگیا۔ گناہ۔ اور لذت گناہ انسانی ضمیر کو گمراہ کرنے کے لئے نت نئی قسم کے صد ہا بہانے اور عذر لنگ تلاش کر لینے میں ہمیشہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ نصیر خاں کو بھی ضمیر کے بار بار ملامت کرنے کے باوجود یہ خیال کر کے سر تسلیم خم کر لینا پڑا کہ اس نے حتی الوسع پوری کوشش کر لی کہ لڑکی پر اپنی اصلیت کا اظہار کر کے اس کی غلط فہمی کو رفع کردے۔ مگر شاید خدا کو یہی منظور معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی اپنی داستان جاری رکھے اور وہ خاموش سنتا رہے۔ اگر اس کو بااصرار خاموش کرتا ہے تو لڑکی بلاشبہ خوف زدہ ہو جائے گی۔ اس بیچاری کو ہمدرد کی تلاش ہے۔ کیا ہرج ہے کہ وہ وکیل بن کر اس کی داستان سن لے اور کوئی ایسی مفید تدبیر بتادے جس سے اس کا غم غلط ہو اور مطلب براری ہو جائے۔ وہ انہی خیالات کی ادھیڑ بن میں تھا کہ لڑکی نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کر دیا:

"میں اب آپ سے صاف صاف عرض کرتی ہوں کہ میرے بھائی کچھ عرصہ سے بری صحبت کا شکار ہو کر گمراہ ہوگئے ہیں۔ مے نوشی اور قمار بازی کا ان کو چسکا پڑ گیا ہے اور مزید برآں میں نے اب سنا ہے کہ وہ کسی پر فریفتہ بھی ہیں۔ انہوں نے پوشیدہ طور پر صد ہا روپیہ قرض لے کر برباد کر دیا ہے قرضداروں نے شاید نالش وغیرہ کی دھمکی دی ہے۔ اس لئے دو روز سے وہ روپوش اور مفقود الخبر ہیں میں جانتی ہوں کہ بجز ذلت و رسوائی کے کوئی

ذریعہ ان کی گلو خلاصی کا نہیں، اور سب سے زیادہ ڈر تو یہ ہے کہ اگر ان واقعات کی اطلاع کانوں کان کہیں میرے چچا کو پہنچ گئی تو وہ ان کو اپنے ورثہ سے ضرور محروم کر دیں گے۔ اس وقت ہم دونوں کی آمدنی کا ذریعہ وہی جائداد ہے۔ جو ہمارے چچا نے ہمارے نام وقف کر دی ہے۔ وہ ان سے یوں بھی ناخوش رہتے ہیں، اگر خدانخواستہ کہیں یہ باتیں سُن پائیں تو پھر ہماری تباہی یقینی ہو جائے گی۔ وقف نامہ کی اوّلین شرط یہ ہے کہ جب تک ان کی عمر پوری تیس۳۰ سال کی نہ ہو جائے وہ جائداد کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اور مجھے بھی یوں پابند کر دیا گیا ہے کہ تاوقتیکہ پچیس سال کی نہ ہو جاؤں اپنی جائداد پر اختیار کُلّی حاصل نہیں کر سکتی بجز اس کے کہ اس سے قبل میں کسی مناسب جگہ اپنی شادی کر لوں۔ قرضے کی رقم تقریباً چار پانچ ہزار کے درمیان تک پہنچ گئی ہے، ہم دونوں کی جائداد کی آمدنی فقط چار سو سالانہ کی ہے۔ اگر تھوڑا بہت میری اس مصوّری سے سہارا نہ ملتا تو شاید گذر اوقات بھی مشکل ہو جاتی۔ میں نے بارہا اس پر غور کیا کہ میں اپنے چچا کے پاس جا کر روپیہ طلب کروں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسی ضرورت پیش کردوں اور کس بہانہ سے کام لوں اور . . . . . . وہ مجھے اور فرید الدین کو خوب جانتے ہیں۔ فوراً سمجھ جائیں گے کہ ضرور کوئی فرید الدین کی ناجائز ضرورت ہوگی۔ . . . . . . آپ دیکھتے ہیں میری مشکلات!"

یہ کہکر اس کا دل بھر آیا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ نصیر خاں اب تک چپ بیٹھا لڑکی کے ایک ایک حرف کو بغور سُن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بولا "آپ گھبرائیں نہیں! پریشان نہ ہوں! . . . . غالباً آپ یہ چاہتی ہیں کہ کسی ذریعہ سے روپیہ قرض مل جائے۔ اور آپ کے چچا کو خبر نہ ہو!"

لڑکی :- (آنسو پونچھ کر) جی ہاں! اگر کوئی ایسی صورت ممکن ہو جائے تو عمر بھر بارِ احسان سے سبکدوش نہ ہو سکوں۔ میں ادائے رقم کے متعلق ہر مناسب شرط پر رضامند ہوں"۔

نصیر خاں :- "میرے خیال میں .... یہ آسان کام نہیں؟ روپیہ کسی طرح بھی لیا جائے بغیر کافی ضمانت کے کوئی نہیں دیتا"۔

یہ سنتے ہی لڑکی کے چہرہ پر مایوسی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "وکیل صاحب! ضمانت کے لئے تو میری جائداد موجود ہے اگر آج نہیں تو دو چار برس کے بعد تو مجھے اپنے حصّہ پر پورا اختیار حاصل ہو ہی جائیگا اُس وقت مجھ سے ہر طرح روپیہ وصول کیا جا سکتا ہے"۔

نصیر خاں :- "افسوس یہ ہے کہ آپ مہاجنوں کی کج خلقیوں اور ریشہ دوانیوں سے مطلق واقف نہیں۔ میری رائے میں آپ اس خیال سے درگذر لے اور جس طرح ہو اپنے چچا ہی کو رضامند کیجیے"۔

لڑکی :- "آہ! - یہ بھی ناممکن ہے ...... (کچھ توقف کے بعد) اچھا! تو اب مجھے ہی کرنا پڑیگا"۔

نصیر خاں :- "وہ کیا؟"

لڑکی :- "شادی"۔

نصیر خاں :- "شادی؟"

لڑکی :- "جی ہاں! کیا آپ کے خیال میں یہ بھی کوئی مشکل کام ہے؟"

نصیر خاں :- "نہیں۔ میرا مطلب یہ نہ تھا۔ بلکہ ...."

لڑکی :- "میں آپ کا مطلب سمجھ گئی۔ ایک صاحب کا پیغام آ چکا ہے"

نصیر خاں :- "ایک کیا صدہا آئے ہونگے۔ مگر ...... کیا آپ

خیال کرتی ہیں کہ یہ صاحب آپ کے موزوں شوہر ہونگے ؟"

لڑکی نے کرسی پر اس طرح پہلو بدلا کہ نصیر خاں اس کے چہرے کی گھبراہٹ کو محسوس نہ کر سکے۔ کچھ دیر تامل کے بعد اُس نے جواب دیا "جی نہیں! سچ پوچھئے تو موزونیت کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔ مگر یہ صاحب میرے مصائب و تفکّرات سے واقف ہونے کے باوجود نکاح کے لئے تیار ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب مجبوراً مجھ کو شادی کر ہی لینا پڑیگی"۔

نصیر خاں "فقط اس لئے کہ آپ اپنی جائداد پر پورا اختیار حاصل کر سکیں ؟"

لڑکی "جی نہیں! بلکہ اپنے بھائی کو موجودہ مصائب سے نجات دلانے کے لئے"۔

نصیر خاں پر اس جواب سے ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی۔ کہ وہ بیساختہ کھڑا ہوکر کمرہ میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ اس کی نظریں گو نیچی تھیں مگر چہرہ سے غور و فکر کے آثار نمایاں تھے۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا "خدا کے لئے آپ اس ارادے سے باز آئیے"۔

لڑکی نے تعجب سے پوچھا "شادی کے متعلق ؟"

نصیر خاں "جی ہاں! شادی اگر بلا لحاظِ موزونیت محض کسی دوسرے مقصد کو مدِ نظر رکھ کر کی جائے تو ظاہر ہے کہ آئندہ زندگی میں میاں بی بی کے خوشگوار تعلقات کی ضامن نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ بھلا آپ سی شریف طینت۔ فرشتہ سیرت خاتون کے لئے کیا یہ خودکشی سے کم ہوگا کہ آپ دیدہ دانستہ اپنی زندگی کو دائمی مصائب و آلام کی بھینٹ چڑھا دیں"۔

لڑکی نے شرم سے نگاہیں نیچی کرلیں اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی "محمد اسمٰعیل خانصاحب! آپ اپنی قسم کے نئے وکیل معلوم ہونے ہیں۔میری ہر تجویز کو مسترد کر دیا۔اب آخر آپ ہی بتائیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

نصیر خاں "صبر!"

لڑکی "اور اگر اس اثنا میں کوئی موزوں اور مناسب پیغام آجائے تو مجھے شادی کر لینی چاہیئے؟"

نصیر خاں "میرے خیال میں نہیں۔آپ اس قدر جلد کسی معقول فیصلہ پر ہرگز نہ پہنچ سکیں گی"

۲

چھوٹی سی میز پر سفید کپڑا بچھا دیا گیا۔دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر چائے پینے لگے۔مگر دونوں الگ الگ اپنی دنیائے تخیل میں محوِ بیخودی تھے۔لڑکی کو مصائب و آلام کی تازہ یاد نے بحرِ غم میں غرق کر دیا تھا۔مزید برآں محمد اسمٰعیل خانصاحب کی آمد اور ان کے مشوروں سے جو کچھ اُمیدیں اور آسرے وابستہ کر رکھے تھے ظاہرا سب شکستہ ہو چکے تھے۔ناکامیوں نے اُس کے لبوں پر مُہرِ سکوت لگا دی تھی اور اس وقت اُس کو اتنا بھی احساس نہ تھا کہ وہ چائے پی رہی ہے۔نصیر خاں کو یہ خلجان تھا کہ دیکھیے لڑکی اب آگے اور کیا کہتی ہے۔وہ برابر اسی ادھیڑبن میں لگا تھا کہ کسی طرح کوئی موقع ہاتھ آئے اور وہ لڑکی کو اپنی اصلیت سے آگاہ کر دے چنانچہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نصیر خاں نے ایک مرتبہ پہلو بدلا۔باہر نظر ڈال کر ایک لمبی سانس لی اور بولا "اللہ غنی! آج کی بارش ہے یا طوفان؟

خدا رحم کرے۔"

لڑکی نے نظر اُٹھا کر نہ تو اس کی طرف دیکھا اور نہ کوئی جواب ہی دیا بلکہ اسی طرح ایک کہنی میز پر رکھے اپنے رخسار کو ہتھیلی کا سہارا دئے رہی۔ دوسرے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی اور اس کی نظر اُس پر جمی ہوئی تھی گویا اس کی کامیابی کے سارے راز اسی میں پوشیدہ تھے۔

نصیر خاں نے اپنی رو میں پھر کہنا شروع کیا "بعض اوقات ایسے موقعوں پر عجیب اہم واقعات پیش آتے ہیں ابھی تھوڑے دنوں کا ذکر ہے کہ میرے دوست نصیر خاں صاحب الٰہی ہی آفتِ ناگہانی میں پھنس گئے۔ مہلک بیماری سے نجات پانے کے بعد ان کو معالج نے یہ ہدایت کی تھی کہ کچھ عرصہ تک دنیاوی مخمصوں سے علیحدہ ہو کر سیر و تفریح میں بسر کریں۔ چنانچہ اسی لئے وہ گھر سے دُور، ایک مقام پر، لبِ دریا بیٹھے شکار کھیل رہے تھے کہ دفعتًہ بارش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ان کے پاس اپنی محافظت کا چونکہ کوئی سامان نہ تھا اس لئے وہ گھبرا کر اُٹھے اور جائے پناہ تلاش کرنے لگے۔ اتفاق دیکھئے کہ قریب ہی ان کو ایک خس پوش جھونپڑا دکھائی دیا۔ جہاں پر انہوں نے کئی بار دستک دی مگر کوئی جواب نہ پا کر مجبوراً دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ہر چند کہ ان کی حرکت نازیبا تھی مگر ان کو اپنی جان کی حفاظت کے لئے ایسا کرنا پڑا۔ اس گھر کی آرائش اور سامان مصوری دیکھ کر ان کو انتہائی حیرت ہوئی۔ اور کچھ دیر بعد ہی ان کو یقین ہو گیا کہ اس کی مالکہ کوئی دوشیزہ مصوّرہ ہے۔ چنانچہ اس خیال سے کہ شاید وہ بھیگتی ہوئی واپس آئے۔ انہوں نے انگیٹھی وغیرہ تلاش کر کے آگ سلگا دی۔"

لڑکی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔ نصیر خاں تجاہل عارفانہ

سے کھانسنے لگا۔ لڑکی خوف زدہ ہو کر اس کو سر سے پاؤں تک مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ پیشانی پر بل ڈال کر اس نے ذرا سخت لہجہ میں کہا۔ اچھا پھر۔ آگے چلئے!

نصیر خاں:۔ اتنے میں مکان کی مالکہ بھیگتی ہوئی واپس آگئی جس کو دیکھتے ہی نصیر خاں کے رہے سہے حواس جاتے رہے۔ اُس کو یقین ہوگیا کہ دوشیزہ اس کی بے جا موجودگی سے ناخوش ہوگی اور ضرور اس کو اسی حالت میں مکان سے باہر نکل جانے پر مجبور کرے گی، مگر واقعات اس کے بالکل خلاف پیش آئے۔ لڑکی کسی آنے والے شخص کی منتظر تھی جس کو اس نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ چنانچہ نصیر خاں کو وہی آنے والا شخص سمجھ کر اس نے خاطر مدارات شروع کر دی۔ نصیر خاں کو حیرت رہی مگر مجبوراً ریاکاری سے کام لے کر خاموش رہنا پڑا۔ لڑکی نے اس کو وکیل سمجھ کر اپنے متعلق ایسے واقعات بیان کرنا شروع کر دئے جن کے سُننے کا حق نصیر خاں سے اجنبی کو ہرگز نہ تھا۔ مگر وہ بیچارہ کیا کرتا۔ اس نے بار بار کوشش کی کہ لڑکی کو اپنی شخصیت سے آگاہ کر دے مگر اس کی معصومیت اور بھولاپن دیکھ کر اپنی قوتِ ارادی کا مختار نہ رہا۔ اور خاموشی کے ساتھ اس کی داستان سُننے پر مجبور ہوگیا۔ مگر ساتھ ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ لڑکی کا راز اس کا راز ہوگا اور تاحیات اس کے سینے میں محفوظ رہیگا؛

لڑکی کھڑی ہوگئی۔ غصہ سے اُس کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ چہرہ تمتمانے لگا۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "نصیر خاں صاحب؟"

نصیر خاں بھی با ادب تمام کھڑا ہوگیا۔ خجالت کے بار سے اس کا سر جُھکا جاتا تھا۔ اس نے اپنی نظریں نیچی رکھ کر کہا: "محترم خاتون! میں اپنی خطا پر خود نادم ہوں۔ سہ شنبہ کل ہے۔ اس لئے آپ کے وکیل محمد اسمٰعیل خانصاحب کے

آنے کا دن بھی کل ہے"۔

لڑکی:- آپ کی حرکت نہایت نازیبا تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے سخت گناہ کیا۔"

نصیر خاں:- بیشک! میں نہیں سمجھتا کہ اب اس کی تلافی کیونکر کروں۔ مگر اتنا ضرور عرض کرتا ہوں کہ خدا کے لئے آپ حصولِ قرض اور ناموزوں شادی ہر دو خیالات سے درگزر رہئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رقم مطلوبہ کل صبح تک پہنچ جائیگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا حافظ!"

یہ کہتا ہوا نصیر خاں دروازہ سے باہر نکل گیا ہوتا۔ مگر کسی کی نازک انگلیوں نے اس کا دامن پکڑ کر روک لیا۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا تو کسی کی پشیمان نظر زبان بے زبانی سے نہ صرف مہمان نوازی کے لئے مصر تھی بلکہ دعوتِ محبت بھی دے رہی تھی۔

(ھمایوں)